جلد ۱۰۳ مارچ ۱۹۸۵ء عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (رحمۃ اللہ علیہ)

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کے لیے بہترین زادِ راہ

تحریک اور کارکن

تالیف:

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترتیب

خلیل احمد حامدی

سائز ۱۸×۲۲/۸ ○ آفسٹ پیپر ○ مجلد ڈائی دار

قیمت ۳۰ روپے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۳	مارچ ۱۹۸۵ء مطابق جمادی الاخریٰ ۱۴۰۵ھ	عدد ۱

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

زرسالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آئیے، تھوڑی دیر کے لیے اپنے اوپر حالتِ اعتکاف طاری کریں اور ایک فکری مکاشفے کا سروسامان کریں۔

انتخابات کا طوفان خیز دور گذر چکا۔ پانی اُتر گیا ہے اور وقت کا دھارا حسبِ سابق پایاب ہوگیا ہے۔ اب سب لوگ ـــ طوفان اُٹھانے والے بھی اور طوفانی موجوں سے لڑنے والے بھی ـــ ساحل پر لوٹ آئے ہیں۔ جو کچھ حالات گذرے وہ بھی اب واضح ہیں، اپنی ناشست بھی سامنے آگئی ہے، کامیابیوں اور ناکامیوں کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ بھی بخوبی لیا جا سکتا ہے۔ نیز اپنی قوت کے سرمایے کے شعور کے ساتھ ساتھ اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا حساب لگانا بھی اب آسان ہوگیا ہے۔ امتحانی معرکے یہی افادیت اپنے اندر رکھتے ہیں کہ وہ قوموں اور حکومتوں، تحریکوں اور جماعتوں بلکہ افراد کے سامنے بھی ان کی خوبیوں اور خرابیوں کا نقشۂ حساب تاریخ کی دیوار پر چسپاں کردیتے ہیں۔ جو قومیں اپنے متعلق نوشتۂ دیوار کو بغور پڑھتی ہیں، وہی آگے بڑھتی ہیں۔ جو اسے نظر انداز کر کے خوش خیالیوں اور مغالطہ آمیز تاویلوں سے سرشار رہتی ہیں مشیت بھی انہیں نظر انداز کردیتی ہے۔

اس وقت موقع نہیں کہ میں میزانیۂ نفع و نقصان کرنے میں آپ کی کچھ مدد کرسکوں۔ البتہ بعض دوسری متعلقہ اُصولی حقیقتوں کو سامنے لانا چاہتا ہوں، جن سے اگر روشنی لی جائے تو تجزیۂ احوال زیادہ آسان ہوجائے گا اور زیادہ صحیح بھی ہوگا۔

خود احتسابی کے لیے پہلا سوال یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ بھی کام کیا ہے وہ خدا کے راست باز اور وفا شعار بندوں اور اس کے ہمہ وقتی کارندوں کی حیثیت سے کیا ہے؟

کیا ہمارے ضمیر پہلے بھی پوری طرح مطمئن تھے کہ یہ کام ہمیں کرنا ہے اور کیا اب اس سے عہدہ برآ ہونے کے بعد ہمیں تسلی ہے کہ ہم نے جو محنت و کاوش کی وہ برحق تھی؟

کامیابی کی صورت میں بھی اور ناکامی کی صورت میں بھی یا کم کامیابی اور زیادہ ناکامی کی صورت میں بھی۔ کیا ہمیں اپنے نظریے، مقصد، طریق کار اور سیاسی جدوجہد کے متعلق کسی قسم کا شک و اشتباہ نہیں ہے؟

اگر ایسا ہے ___ اور جس جس فرد کی یہ کیفیت ہے کہ وہ اپنی مخلصانہ خدمات اللہ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے بعد راضی مطمئن ہے، اُس کے ہر اقدام، ہر ملاقات، ہر گفتگو اور خرچ کیے ہوئے ہر پیسے کے لیے نیک جزا ہے۔

یہ تو ایک ڈیوٹی تھی جو دین کی طرف سے عاید تھی، جس جس نے اسے اخلاص و اعتماد کے ساتھ بخیر و خوبی انجام دیا اُس نے اپنے مالک کی رضا حاصل کر کے بہت بڑی کمائی کر لی اور آئندہ کے لیے وہ اور زیادہ ذمہ داریاں ادا کرنے کے قابل ہو گیا۔

اور اگر کسی کے دل میں شک اور پریشانی کے کانٹے چبھ گئے ہوں تو اس کی نجات اسی میں ہے کہ وہ آرام سے بیٹھ کر ان کانٹوں کو نکالے۔

دل لگا کر سوچنے کا ایک سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے ادارۂ سیاست کی اصلاح یا انقلاب قیادت کے کام کو آسان اور قلیل المیعاد سمجھ رکھا ہے؟

اگر ایسا تاثر دلوں میں موجود ہو تو اسے نکال دینا چاہیے۔ کیونکہ ہمارے سامنے جو مزاحم قوت کھڑی ہے وہ کسی قلعے کی سنگین فصیل کی طرح مضبوط ہے اور اس فصیل کی برجیوں میں بھاری اسلحہ کے ساتھ دیدبان بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمارے سیاسی نظام پر نہ صرف پاکستان

بننے کے وقت سے، بلکہ اس سے قبل کے انگریزی دور سے سرمایہ داروں، جاگیر داروں وڈیروں، رسہ گیروں اور جرائم پیشوں کا ایک پکا محاذ بنا ہوا ہے۔ بدقسمتی سے ہر قسم کے مفاد پرست لوگ اور لادینیت پسند مغرب زدہ عناصر، جن میں کمیونسٹ اور سوشلسٹ بھی شامل ہیں، اس محاذ کے ساتھ آسانی سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ غلامی کے دور کی تربیت یافتہ، خیانت کار بیوروکریسی جس کے ہاتھ میں ملک کی انتظامی مشینری ہے، ایک منظم جماعت بن کر سازشی طریقوں سے متذکرہ محاذ سے گٹھ جوڑ کر لیتی ہے۔ چنانچہ دولت، جرم، مفاد پرستی، لادینیت پسندی اور بیوروکریسی کے اسی محاذ کا قبضہ پاکستان بننے سے پہلے بھی سیاست پر تھا اور اسی کا قبضہ آج بھی ہے۔ کوئی بھی دور ہو اور کیسے بھی حالات ہوں، قیادت اور نمائندگی کے مناصب پر اسی محاذ کے چہیتے ہر بار نمودار ہوتے ہیں[1]۔ حالیہ انتخابات میں کھڑے ہونے والوں کی فہرست بنا کر ان کا "شجرہ نسب"

---

[1] پچھلے کچھ عرصے سے بڑے چرچے تھے کہ "اسلامی انتخاب" ہوگا اور مخالفِ اسلام نظریات رکھنے والے اور غلط کردار کے لوگوں کو آگے نہیں آنے دیا جائے گا۔ اور ان باتوں سے دینی حلقوں میں کچھ خوش فہمی بھی تھی۔ لیکن ساری خوبصورت باتیں ہوا ہو گئیں۔ حتیٰ کہ شناختی کارڈ کی پابندی کے اعلانات بھی ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ بات وہیں پہنچ گئی جہاں مذکورہ محاذ کے مفاد کا تقاضا تھا۔ آج کتنے ہی ایسے لوگ میدان میں ہیں جن کو قومی مجلس کے لیے نامزد کیا گیا تھا، کتنے ہی وہ ہیں جو جرائم کی وادیاں پار کر چکے ہیں۔ پھر پیپلز پارٹی کے کثیر التعداد افراد ہیں، ایکٹر اور کھلاڑی ہیں۔ یہاں جو گھن چکر بنا ہوا ہے اس سے باہر نکل کر قوم کو کسی صحت مند سیاسی راستے پر ڈالنا فی الحال کسی بڑے سے بڑے مردِ جری اور اسلام کے کسی عظیم ترین نعرہ باز سے بھی ممکن نہیں ہے۔ آج تک کسی نے نہ اس گھن چکر کو چھیڑا ہے اور نہ اوپر آنے والوں میں سے کوئی اسے چھیڑنے کا خیال بھی کر سکتا ہے۔ تمام انتخابی قواعد اور ان کے تحت جعل سازی اور بدعنوانی کرنے کے معروفِ عام راستے اور ان کی روک تھام کے لیے بے نتیجہ ضابطے اور یقین دہانیاں فی الحال اسی طرح (باقی بر صفحہ آئندہ)

دیکھ لیجیے۔ یہ بھی ذہن نشین رکھیے کہ عالمی قوتیں بھی اس محاذ کو مسلط رکھنا چاہتی ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ انگریزی سامراج سے نجات جتنی مشکل سے ملی اُس سے پچاس گنا مشکل سے ہمیں متذکرہ محاذ سے نجات مل سکتی ہے[1]۔

ہم لوگ جب اصلاحِ سیاست اور انقلابِ قیادت کے لیے اُٹھتے ہیں تو اس محاذ کے پھیلاؤ اور اس کی مضبوطی کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے اور اس میں رخنے پیدا کرنے کے لیے کوئی ایسا نقشہ کار بھی ہمارے سامنے نہیں ہوتا جو حقیقی طور پر مؤثر ہو سکتا ہو۔ انتخابات بھی ہمارے ساتھی ہر حلقے میں یوں محسوس کرتے ہیں کہ کسی خاص شخص یا اشخاص سے مقابلہ درپیش ہے اور اس مقابلے کے لیے اچھا کردار اور اچھا منشور فیصلہ کن ذریعہ ہو سکتا ہے۔ عزائم کی یہ محدودیت اور نگاہوں کا یہ ارتکاز اس امر میں

(حاشیہ صفحہ سابقہ)

رہیں گی۔ شرافت اور دیانت کو جو بھاری مشکلات ان وجوہ سے پہلے درپیش تھیں وہی آئندہ رہیں گی۔ اس وقت تک جب تک اس گھن چکر کو توڑنے کے لیے کاری وار کیے جائیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

۱؎ خیال اس بات کا بھی رہے کہ اہلِ قوت و اثر میں سے کوئی عنصر بھی بحیثیت مجموعی ایسا نہیں جس کے دل کے دروازے داعیانِ اقامتِ دین کے لیے کھلے ہوں۔ حتیٰ کہ جن کے دم سے اسلام کا بڑا غلغلہ ہے وہ چاہے حکومت کے ایوانوں میں ہوں یا مسجدوں میں وعظ فرماتے ہوں یا بستی بستی گلی گلی تبلیغ کرتے پھرتے ہوں، سب کے سب ہمارے خلاف متحد الخیال ہیں۔ خاص طور پر اربابِ حل و عقد میں سے جن جن کی زبانوں سے اسلام کے قصیدے سُن کر یا نماز، روزے، تراویح اور حج و عمرہ کی ادائیگی دیکھ کر ہمارے جذبات کے پھول کھل اُٹھتے ہیں وہ بھی دنیائے سیاست میں برائے نام حد تک ہمارا وجود برداشت کرنے کے روادار ہیں، مگر اس کے سخت مخالف ہیں کہ قوت و اثر میں ہمارا کوئی دخل ہو۔ انتخابی عمل میں ہماری ناکامی ان کا عین سرمایہ مسرت ہے۔

لہ کاوٹ بن جاتا ہے کہ ہم ہمہ گیر سیاسی معرکے کے خطوطِ عمل تجویز کر سکیں اور لمبی محنت سے مختلف حلقوں میں اتنی عوامی قوت کو پہلے سے تیار کر کے سامنے لے آئیں کہ ہر بار چند بڑے بتانِ قیادت کو استھانوں سے گرایا جا سکے۔ محض چند سیٹیں حاصل کر لینا باعثِ اطمینان نہیں ہونا چاہیے۔

کرنے کو جو کچھ کیا جائے، یہ ایک لمبی لڑائی ہے اور محنت و قربانی کی بڑی مقدار مانگتی ہے۔ محض جلسوں اور پوسٹروں کے بل پر اسے جیتنا ممکن نہیں۔ پھر ہمارے بجائے مقصد کے لحاظ سے عوامی حلقوں میں ہمارا سیاسی و انتخابی کام متعدد کمزوریاں رکھتا ہے۔ اسی طرح مزاحم قوت کے مستحکم قلعے کی موجودگی، انتخابی ماحول اور قواعد و ضوابط کی ناسازگاری کے ساتھ جب ہماری اپنی کوتاہیاں شامل ہو جاتی ہیں تو نتائج پریشان کرتے ہیں۔

اس طولِ کلام کا مدعا یہ واضح کرنا ہے کہ اصلاحِ سیاست اور انقلابِ قیادت کا کام بھاری ہے، لمبا ہے، مشکل ہے۔ اس راہ پر ہر بار چار قدم چلنے کے بعد سوچنا کہ "ابھی منزل کیوں نہیں آئی" یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم چھوٹے حوصلوں کے ساتھ اور مختصر سا ٹائم ٹیبل سامنے رکھ کے چلے ہیں۔

اب بھی کامیابی و ناکامی کی مقدار سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی مہم کے بھاری بھرکم پن کو اچھی طرح محسوس کریں اور جمہوری راستے سے انقلابِ قیادت برپا کرنے کے طویل عمل کی رفتار بڑھانے کے لیے بہتر نقشۂ کار بھی تیار کریں اور حوصلوں کو بلند، عزم کو محکم اور صبر و استقامت کی قوت کو اور زیادہ مؤثر بنائیں۔

متذکرہ نقشۂ کار کے خطوط آئندہ واضح کیے جائیں گے۔

اہلِ ایمان کے لیے کامیابی بھی آزمائش ہے اور ناکامی بھی۔ اس آزمائش سے اگر صحیح طور پر عہدہ برآ نہ ہوا جائے تو کامیابی بھی وجہ خرابی بن جاتی ہے اور ناکامی بھی۔

کامیابی مجموعی ہو یا جزوی، ہر حال میں وہ اپنے اندر خطرات رکھتی ہے۔ سب سے پہلے تو کامیابی کا وہ نشہ ہوتا ہے جو خدا کے شکر کی جگہ الٹا فخر و کبر پیدا کر دیتا ہے۔ کامیابی میں وہ طرب کی کیفیت ہوتی ہے کہ آدمی کی نگاہیں اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو دیکھ ہی نہیں پاتیں۔ اس طرح بسا اوقات خود کامیابی آئندہ کی ناکامیوں کا سبب بن جاتی ہے۔

اسی طرح اگر اقامتِ دین کے لیے جہادِ مسلسل کرنے والی قوت کو ایک مرتبہ نہیں، دس مرتبہ بھی ناکامی پیش آئے، اس کا اثر وھن و حزن اور یاس و قنوط کی صورت میں نمودار نہیں ہونا چاہیے۔ تیمور بار بار کی ناکامیوں اور پریشانیوں کی وجہ سے جب انتہائی دوں ہمتی میں گھرا ہوا تھا تو اُس نے دانہ منہ میں لے کر دیوار پر چڑھتی ہوئی کسی چیونٹی کو بیسیوں بار گرتے دیکھا اور پھر یہ دیکھا کہ آخر ایک ہلے میں اس نے دیوار کی بلندی کو فتح کر لیا۔ تیمور نے جو سبق چیونٹی سے لیا تھا اُس سے زیادہ روشن اور واضح اور مؤثر اسباقِ عزم انگیز قرآن کے اوراق میں موجود ہیں۔ اگر قرآن کے علمبردار ہی بلند ہمتی کے ان اسباق سے استفادہ نہ کر سکیں تو پھر کون ان کی ہمت بندھا سکے گا۔

معرکہ ہائے حق و باطل میں اہلِ حق کو جسمانی یا مادی یا واقعاتی طور پر جو شکست ہوتی ہے وہ زیادہ خطرناک نہیں ہوتی، لیکن جب شیطان نظریہ و اعتقاد اور قوتِ ارادی اور ذوقِ معرکہ آرائی کو قنوطیت کے حربے سے باطنی شکست دے دیتا ہے تو پھر عمل کی قوتیں ایسی مفلوج ہوتی ہیں کہ آئندہ بھی فتح کا کوئی دروازہ نہیں کھولا جا سکتا۔

پس شیوۂ مردانِ حق یہی ہے کہ لا تفرحوا علی ما آتکم ولا تحزنوا علی ما فاتکم۔

معرکوں کے بعد یہ جائزہ لینا بہت ضروری ہوتا ہے کہ کیا کھویا کیا پایا۔ جیسے جنگ کے بعد یہ حساب بھی لگایا جاتا ہے کہ مفتوحہ علاقے کی سرحدیں کتنی

کم یا زیادہ آگے بڑھیں، یا خدانخواستہ پیچھے ہٹیں، یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ حاصل شدہ مالِ غنیمت کی فہرست کیا ہے، ساتھ ہی یہ بھی جائزہ لیا جاتا ہے کہ کتنے افراد کھیت رہے، یعنی کشمکش کے دوران میں یا اس کے اثراتِ مابعد کے تحت تحریکی لحاظ سے بے جان ہو گئے، کتنے لوگ ایمان و عزم کے لحاظ سے زخم خوردہ ہیں۔ کس کس کو کتنے گہرے یا ہلکے زخم آئے ہیں اور ان کے لیے صورتِ چارہ گری کیا ہے؟

جائزہ اس بات کا بھی لینا ہے کہ سیاست کے بگولوں میں گھر کر کہاں کہاں دینی و اخلاقی معاملات میں غفلت ہوئی؟ جذباتی رَو میں کیا کیا غلط قدم اُٹھائے گئے؟ بگڑی ہوئی سیاست کی آلائشوں سے دامن کہاں تک آلودہ ہوئے؟ ہمارے ایمانی و اخلاقی اور دستوری روایاتی معیار کہاں کہاں گرے ہیں؟ خلق کی طرف بھرپور توجہ کرنے کے دَور میں خدا سے معاملہ کیسا رہا۔

کیا کسی نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں ذاتی سطح پر ہوسِ اقتدار پیدا ہوئی؟ کیا وہ خود اس میدان میں آگے بڑھا یا اُس نے یہ چاہا کہ بعض لوگ اسے آگے بڑھائیں؟ کیا ووٹروں کو خوش کرنے کے لیے کھلم کھلا مبالغہ آمیز اور غیر حقیقت پسندانہ باتیں کی گئیں؟ کیا نامعقول قسم کے نعرے لگائے گئے؟ کیا ایسے وعدے کیے گئے جن کے پورا کر دکھانے کا خود بھی گمانِ غالب نہ ہو؟ کیا حریفوں کے لیے بدگمانی سے کام لیا گیا؟ کیا پولنگ کے عمل میں کسی طرح کی بدعنوانی کی گئی؟ کیا کسی فریق کے ساتھ معاہدہ کر کے اُسے توڑا گیا؟

اگر ایسی کسی بھی چیز کا اپنے اندر یا اپنے ساتھیوں میں سراغ ملا ہو تو اُسے لازماً سامنے لا کر اس کی اصلاح کی جائے۔ غلطی کرنے والا خود احباب کے سامنے اعتراف کرے اور خدا کے حضور ہر آلائش سے نجات پانے کے لیے توبہ کرے اور کسی نہ کسی شکل میں کفارہ دے۔ محض لیپاپوتی سے کام نہ لیا جائے اور غور و بحث کا انداز بھی نزاعی نہ ہونے پائے۔ تمام باتیں اجتماعیت کی روشنی میں آئیں اور سب مل کر ان کا ازالہ کریں۔

پچھلے معرکے کے جو کچھ بھی نتائج نکلیں، اچھے ہوں تو اُن پہ اترائے بغیر اور امیدوں امنگوں سے کم یا بہت ہی کم ہوں تو ان پر حزن و یاس میں ڈوبے بغیر، آئندہ کے لیے کام کی بہتر منصوبہ بندی کر کے زیادہ مضبوط ارادوں کے ساتھ اقدامِ تازہ کی تیاری کرنی چاہیے۔ زندہ قوموں اور زندہ رہنے والی قوموں کا مسلک یہی ہے۔ محض سابقہ کامیابیوں سے بدمست رہنا یا ناکامیوں پہ بسورتے رہنا قوت و ترقی کا سفر ختم کر دینے کے مترادف ہے۔

ہمارے سارے کام کا انحصار اس پہ ہے کہ خدا سے تعلق اور خلقِ خدا سے تعلق کے لحاظ سے ہم کہاں کھڑے ہیں۔ اگر معاملہ اُدھر بھی کم سے کم معیار تک کا ہو اور اِدھر بھی واجبی ہی سا رہے تو کوئی بڑا کام تو ہونے کا نہیں، خواہ چالیس سال لگے رہیے یا سو سال۔

سوال یہ نہیں کہ مسلمان ہونے کی کم سے کم ضروری شرائط کیا ہیں، بلکہ یہ ہے کہ اقامتِ دین کے داعیوں یا بندگانِ خدا کو اسلامی خطوط پر اصلاح و انقلاب کا درس دینے والوں کا کم سے کم کیا معیار ہونا چاہیے۔ اس معیار کو سرسری قسم کی گفتگوؤں یا ڈھلی ڈھلائی تقریروں یا اسٹیریو ٹائپ پمفلٹوں اور مضمونوں سے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے باطن کی تبدیلی ضروری ہے اور قلب و ذہن میں ایک جاندار اور غیر زوال پذیر حرکت پیدا ہونی چاہیے۔

آخر میں ایک ضروری انتباہ!

ہر بڑے ہنگامۂ کار، خصوصاً کسی کشمکش سے نکلنے کے بعد دُنیا پرست جماعتوں میں ایسی تند و تیز بحثیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ تادیر داخلی آویزش کام کرتی ہے۔ بعض اوقات کامیابی کے غلط وجوہ کی حمایت کرنے اور کبھی ناکامیٔ عمل کے حقیقی اسباب کا کھوج لگانے کے بجائے اُس کا الزام نظریہ اور طریق کار یا قیادت کے سر رکھنے کی وجہ سے بڑی نزاعات

پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس موقع پر غلط قسم کی مفاخرت کرتے اور الزامات لگانے سے بچ کر ٹھنڈے ماحول میں حالات کا تجزیہ کرنا چاہیے۔ اس تجزیے میں اپنے ایمانیات، اپنے اُصولوں، اپنے برسوں کے مسلّمات اور اپنی مستقل دستوری و اخلاقی روایات کو ہمیشہ بالاتر رکھنا چاہیے۔

وہ تمام باتیں جنھیں ہم نے برسوں پہلے لمبے غور و فکر کے بعد ٹھونک بجا کر قبول کیا ہے ___ اور معاشرے پر اُن کے غلبے کی مشکلات اور ان مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے طویل جدوجہد کا تصور سامنے رکھ کر قبول کیا ہے ___ اب ہوا کے وقتی کسی خوشگوار یا ناخوشگوار جھونکے کی وجہ سے ہم اُن کو بے وزن نہیں قرار دے سکتے بلکہ یہ بھی قبول نہیں ہے کہ اُن پر مخالفانہ سوال اُٹھانے اور تردیدی بحثیں کرنے کی راہیں کھولی جائیں۔ جو چیزیں ہماری اساس ہیں، اگر وہ قابلِ تزلزل ہیں تو ان پر پھر کوئی تعمیر ترکیجا، کوئی ایک ردّہ بھی پائیدار نہیں ہوسکتا۔

حالات و واقعات پر غور ضرور کیجیے، مگر ٹھنڈے ماحول میں کیجیے۔ پیار بھرے انداز سے کیجیے، ایک دوسرے کا منہ نہ نوچیے۔ ایک دوسرے پر پھبتیاں نہ ماریے۔ اپنے محکم اساسی اُصول و مقاصد اور روایات و اقدار کی طرف اشتباہ کی انگلی اُٹھانے یا اعتراض کا وار کرنے سے پہلے اپنی کوتاہیِ عمل کا محاسبہ ضرور کر لیجیے۔ (یہ سطور ۸ فروری کو لکھی گئیں)۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں۔ اُن کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔ (ادارہ)

مسجدِ نبویؐ

جناب شاہ بلیغ الدین صاحب

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اُس زمانے میں مدینے کے گورنر تھے۔ ربیع الاوّل ۸۸ھ مطابق ۷۰۶ء کے مبارک مہینے میں بنی اُمیہ کے چھٹے حکمران ولید کا ایک خاص ایلچی مدینہ آیا۔ عمامے کے کچھ پیچ بندھے تھے، کچھ کھُلے۔ ظاہری حالت دیکھ کر خیال ہوتا تھا، نہ جانے کیا پریشانی کی خبر لایا ہے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فوراً بلایا، پوچھا کیا خبر لائے ہو؟ کیا حال ہے؟ اُس نے عرض کیا سب ٹھیک ہے۔ ایک خط آپ کے نام لایا ہوں۔ خط اس نے حوالے کر دیا تو خط پڑھ کر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے لوگوں کو جمع کیا۔ ان سے خط کے مضمون پر بات چیت کرتے رہے۔ پھر ان لوگوں کو بُلا بھیجا جن کے گھر مسجد نبوی کے آس پاس تھے۔ اُن سے گفتگو ہوئی تو اپنے کچھ عزیز رشتہ داروں کو بلوایا اور ان سے بات چیت کرتے رہے۔

خط میں لکھا تھا — مسجد نبویؐ کو پھر سے بنایا جائے۔

نقشِ ثانی مسجد نبویؐ کی توسیع کا خیال سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے ذہن میں آیا۔ ۱۷ھ ہجری، ۶۳۸ عیسوی میں بات یہ تھی کہ مدینے کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی۔ اللہ نے اپنے کرم سے مسلمانوں کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچا دی تھی۔ اب یہ مسجد نمازیوں کے لیے کافی نہ تھی اِس لیے اس میں گنجائش بڑھانا ضروری تھا۔

مسجد نبویؐ کی توسیع کا مرحلہ بڑا نازک تھا۔ چاہے ضرورتوں کا کچھ بھی حال ہو،

حضور اکرمؐ کی بنائی ہوئی مسجد میں ذرا بھی تبدیلی کرتے ہوئے احساسِ عقیدت کو ٹھیس پہنچتی تھی۔ ویسے حضورؐ نے خود اپنی زندگی میں فتح خیبر کے بعد مسجد نبویؐ کو بڑھایا تھا۔ حضرت عمرؓ نے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے نہ سنتا کہ اس مسجد کی توسیع کرتا ہے تو ہرگز اس کی توسیع کا خیال بھی نہ کرتا۔

ایوانِ حکومت مسجد نبویؐ کی اس زمانے میں دو بڑی حیثیتیں تھیں۔ ایک مسجد کی، دوسری ایوانِ حکومت کی!! حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ یہیں بیٹھ کر رائے مشورہ کرتے سفیروں سے ملاقاتیں فرماتے۔ یہیں جنگ کے نقشے بنائے جاتے۔ یہیں سے سپہ سالاروں کو احکامات جاری ہوتے۔ نظم ونسق کا سارا کام یہیں ہوتا۔ اس زمانے میں مسجد اپنی اصلی حالت میں تھی۔ وہی کچی اینٹوں کی دیواریں اور وہی کھجور کی ٹہنیوں کی چھت!!

اللہ اللہ وہ بھی کیا منظر تھا کہ اس کھجور کے پتوں کے نیچے اپنی عبا کو تکیہ بنائے فاروق اعظمؓ سو رہے تھے تو سامنے سے زرق برق لباس پہنے، زر و جواہر کا تاج سر پہ جمائے، سلطنتِ عجم کا امیر الامراء ہرمزان چلا آیا۔ ساتھ طبل وعلم، لاؤ لشکر، نقیب، نقارچی ایک سے ایک بڑھ کر ٹھاٹھ دکھاتے آئے۔ خدمت گاروں کے جھلمل جھلمل کرتے جوڑے اور ان کے ہاتھوں میں سونے چاندی کے مورچھل اور سنہری روپہلی عصا عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ مسجد نبویؐ پہنچ کر ہرمزان نے پوچھا: تمہارے بادشاہ کا محل کہاں ہے؟ حضرت انسؓ بن مالک اور حضرت احنفؓ بن قیس سے جو میدان جنگ سے اُسے پکڑ لائے تھے، بولا۔ مجھے یہاں کہاں لے آئے؟ اپنے بادشاہ کے پاس لے چلو۔

مغیرہ بن شعبہؓ جو پاس کھڑے تھے، بولے۔ تم ایوانِ حکومت میں امیر المومنین کے سامنے ہی تو ہو! ان پیوند زدہ کرتا پہنے ہوئے بزرگ کو دیکھتے ہو جو اپنے ہاتھ کا تکیہ بنائے اپنی عبا پر سر رکھے سو رہے ہیں، یہی مسلمانوں کے امیرالمومنین ہیں، تمہاری عظیم الشان سلطنت کے فاتح! اور یہ کچی دیواروں کا سائبان ہمارے نبیؐ کی بنائی ہوئی مسجد ہے، جو ہمارا ایوانِ حکومت بھی ہے؟ یہ وہ زمانہ ہے جب نوشیروان کا بنایا ہوا اسفید محل حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی رہائش گاہ بن گیا تھا۔ کچھ آگے پیچھے یہی زمانہ ہے کہ اسکندریہ

کے عالیشان سنگِ مرمر کے محل حضرت عمروؓ بن عاص کے قبضے میں آ گئے۔ ہر جگہ سے بے اندازہ مالِ غنیمت مسلمانوں کے قبضے میں آیا تھا لیکن مسلمانوں کا ایوانِ حکومت اب بھی وہی تھا جو حضور اکرمؐ کے زمانے میں تھا اور مسلمانوں کا امیر اب بھی اسی حال میں رہتا تھا جیسا کچھ وہ ہجرت کے ابتدائی دنوں میں رہتا تھا۔

مسلمانوں نے شہر کوفہ بسایا۔ یہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا صدر مقام قرار پایا، تو یہاں مسجد اور دفاتر بنائے گئے۔ سرزمینِ نیل پر مسلمانوں نے اپنا شہر فسطاط بسایا اور یہ مصر میں اسلامی دارالحکومت قرار پایا تو یہاں عمرو بن عاص نے عالیشان عمارتیں تعمیر کرائیں۔ ایک بڑا بھاری محل امیرالمومنین کے لیے بھی بنوایا گیا۔ حضرت عمرؓ نے سُنا تو فوراً لکھ بھیجا ـــ تم نے بیکار وہاں میرے لیے مکان بنوایا، یہ کس کام کا ہے؟ فوراً اسے فوجیوں کے رہنے کے لیے دے دو! ساری سلطنتِ عجم اور آدھی سے زیادہ سلطنتِ رُوم فتح کر کے بھی فاروقِ اعظمؓ مسجد نبویؐ کے فرش پر بیٹھ کر کام کرتے رہے اور ان کے رہنے کا مکان گھاس پھوس ہی کا رہا۔

دَورِ فاروقیؓ اب مسجد کی جو توسیع کی گئی تو وہی پتھر کی بنیادیں تھیں، وہی کچی مٹی کی دیواریں، وہی کھجور کے تنوں کے ستون اور وہی کھجور کی ٹہنیوں کی چھت۔ آپ نے حضرت عباسؓ کا پورا مکان اور حضرت جعفر طیار کا آدھا مکان مسجد میں لے لیا اور مغرب کی طرف دو عدد ستون اور بڑھا دیے۔ کوئی بیس ہاتھ کی یہ جگہ نکل آئی اور قبلے کی طرف ایک کمان نکلوائی، جس کی چوڑائی کوئی دس ہاتھ تھی۔ اب مسجد کا طول ایک سو چالیس ہاتھ اور عرض ایک سو بیس ہاتھ ہو گیا۔ مسجد کے دروازے چھ کر دیے گئے۔

اُس زمانے میں ایران فتح ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہاں سے نفط (تیل) منگوا کر مسجد نبویؐ میں چراغ روشن کیے۔ مسجد نبویؐ میں چراغاں دیکھ کر سیّدنا حضرت علیؓ نے بے اختیار دُعا کی کہ ـــ یارب! ابوحفص (حضرت عمر فاروقؓ) کی قبر کو بھی اسی طرح روشن کر دے۔

مسجد کے مشرقی کنارے پر ایک چبوترا بنایا گیا اسے بُطَیحا نام دیا گیا۔ یہاں مسلمان

بیٹھ کر زندگی کے مختلف معاملات کے بارے میں بات چیت کرتے تھے۔ پہلے یہ بتایا تھا کہ امیر المومنین مسجد کے صحن کونے میں بیٹھے حکومت کا کام کاج کرتے ہوتے، وہیں لوگ بیٹھے اپنے مطلب کی باتیں کیا کرتے جس کی وجہ سے تو جہ بٹ جایا کرتی تھی۔

عہدِ عثمانی رض مسجد نبوی میں توسیع کو کوئی بارہ برس گزر چکے تھے۔ حضرت عثمان کی خلافت کا پانچواں سال تھا کہ انہیں مسجد نبوی کی توسیع کا خیال آیا۔

حضرت عمر رض نے جو مسجد نبوی کی توسیع کی تھی تو حضور اکرم کی رکھی ہوئی بنیادوں کو جوں کا توں باقی رکھا تھا۔ بس مشرق کی سمت کچھ حصہ بڑھا یا گیا تھا۔ اضافہ کیے ہوئے حصے میں جو سامان لگایا گیا تھا وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا رسالت پناہ نے استعمال فرمایا تھا۔

حضرت عثمان رض نے پوری مسجد کو پھر سے بنوایا۔ اس وقت دلوں کا عجیب حال تھا وہ دن نظروں میں پھر رہے تھے جب آقائے دو جہان نے حرمِ امن، مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی پہلی عبادت گاہ تعمیر فرمائی تھی۔ وہ مسجد جس میں پڑھی ہوئی ایک نماز دوسری مسجدوں کی ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ جو گھر سے یہاں نماز پڑھنے کی نیت سے وضو کر کے چلے اور یہاں آ کر نماز پڑھ لے وہ ایک حج کے ثواب کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ یہیں وہ منبر نبوی ہے جس کے بارے میں ایک ارشاد ہے کہ — میرا منبر حوضِ کوثر پہ ہے اور دوسرا ارشاد ہے کہ — میرا منبر جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری پہ ہے۔

گوشۂ جنت یہ جگہ جہاں مسجد نبوی بنائی گئی، دو یتیم انصاری لڑکوں سہیل اور سہل کی تھی جن کا تعلق بنی نجار سے تھا اور جو حضرت اسعد بن زرارہ رض کی نگرانی میں پل رہے تھے۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ معاذ بن عفرا رض اُن کے سرپرست تھے۔ یہی وہ مبارک جگہ تھی جہاں مدینہ پہنچنے پر حضور اکرم کی سواری کی اونٹنی بیٹھی تھی۔ ارشاد تھا — کہ میں وہیں اُتروں گا جہاں یہ اونٹنی بیٹھے گی، کیونکہ اسے قدرت کی طرف سے میرے اُترنے کی جگہ بتا دی گئی ہے۔ یہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں۔ ایک طرف مشرکوں کی قبریں، اور کچھ کھجوروں کے درخت تھے۔ امام زہری کا بیان ہے، حضرت ختمی مرتبت نے جب یہ طے فرما دیا کہ یہ جگہ مسجد نبوی کے لیے خریدی جائے گی تو اس کا معاوضہ دس دینار

سیدنا حضرت ابوبکرؓ نے یتیم لڑکوں کو ادا کر دیا۔ کھجور کے درخت کٹوا کر قبلہ کی طرف باڑھ لگا دی گئی۔ مشرکوں کی قبروں کو کھدوا دیا گیا۔ یہ وہ مبارک جگہ تھی جہاں سرورِ کائناتؐ کی ہجرت سے پہلے بھی نماز ہوتی تھی۔ حضرت ابوامامہؓ اور اسعد بن زرارہؓ یہاں جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے۔ صرف ایک لانبی دیوار اس غرض کے لیے بنی ہوئی تھی۔ اب یہی جگہ جنت کی ایک کیاری بننے والی تھی۔

زمین خرید لینے کے بعد اب مسجد کی تعمیر کا سوال پیدا ہوا۔ حالات کے لحاظ سے یہ بڑا سوال تھا لیکن آقائے دوجہاں خود بنیاد کھودنے، پتھر اور مٹی ڈھونے میں لگ گئے۔ شاید یہی منظر دُنیا نے اُس وقت بھی دیکھا ہوگا، جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو ساتھ لے کر خدا کا پہلا گھر بنایا۔

مسجدِ قُبا | مدینہ پہنچنے سے پہلے حضور اکرمؐ کچھ دنوں کے لیے مدینے سے بالکل قریب ہی ایک چھوٹی سی بستی قُبا میں تشریف فرما رہے تھے۔ چار دن یا چودہ دن؟ اس بارے میں اختلاف ہے ـــــ اس دوران میں باقاعدہ اور باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے آپ نے یہاں بھی اپنے دستِ مبارک سے ایک مسجد کی بنا ڈالی۔ جو مسجدِ قُبا کے نام سے مشہور ہوئی۔ جس کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے کہ ـــــ لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ ۚ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ـــــ وہ مسجد جس کی بنا پہلے ہی دن سے پرہیزگاری پر رکھی گئی، وہ مسجد اس کی پوری مستحق ہے کہ آپ اُس میں کھڑے ہوں، یہ ظاہری اور باطنی پاکی کو پسند کرنے والے اشخاص کی مسجد ہے اور اللہ طاہروں کو پسند کرتا ہے ـــــ مسجدِ قبا کے بارے میں یہ وحی نازل ہوئی تو اللہ کے رسولؐ نے بنی عمرو سے پوچھا کہ ـــــ یہ کون سی پاکی اور طہارت ہے؟ روض الانف میں امام سہیلی نے لکھا ہے کہ بنی عمرو استنجا کرنے کے بعد پانی سے بھی طہارت کرتے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجدِ قُبا کی صرف حد بندی فرمائی تھی اس کی تعمیر نہیں فرمائی۔ اس مسجد کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تجویز حضرت عمار بن یاسر نے پیش کی تھی۔

ہجرت سے پہلے کا زمانہ وہ تھا کہ مسلمان چھپ چھپ کر عبادت کرتے تھے۔ خدا کا نام لینے پر کیا کیا پابندیاں نہ تھیں۔ کلمہ تک بھی تو کوئی پکار کر نہ پڑھ سکتا تھا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود پر کفار نے کیا کیا ظلم نہ ڈھائے تھے۔ کتنی ہی باراِن عاشقانِ پاک طینت کی زندگی بس سانس سے بندھی رہ گئی تھی۔ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ اس قدر مار کھانے کے بعد یہ اللہ کے نیک بندے زندہ بھی رہ سکیں گے یا نہیں۔ یہ ظلم و بربریت کا مظاہرہ صرف اس لیے تھا کہ انہوں نے خانہ کعبہ میں اونچی آواز سے خدا کا نام لیا تھا اور آج قدرت نے مدینۃ النبیؐ میں وہ دن لائے تھے کہ مسلمان کھلے عام ایک عبادت گاہ تعمیر کر رہے تھے۔

سنگِ بنیاد مسجد نبویؐ کا پایہ پتھر اور چونے کا تھا۔ یہ تین ہاتھ گہرا رکھا گیا۔ دیواروں میں کچی اینٹ لگائی گئی تھی۔ لمبائی ستر ہاتھ اور چوڑائی ساٹھ ہاتھ تھی۔ قبلہ بیت المقدس کی طرف بنایا گیا تھا۔ ہجرت کے سترھویں مہینے قبلہ بدلنے کا حکم آیا تو آپ کوئی دو ہفتے تک اسطوانۂ عائشہؓ کے سامنے کھڑے رہ کر نماز پڑھاتے رہے پھر آپ اس طرف آ گئے جہاں اب آپ کا مصلّیٰ بنایا جاتا ہے یہ جگہ میزابِ رحمت کی سمت میں ہے۔ پرانے قبلہ کی طرف ایک چبوترا تھا۔ یہاں اہلِ دل اور اہلِ علم پڑھنے لکھنے میں لگے رہتے تھے۔ صُفّہ کی یہ درس گاہ تاریخ اسلام کی پہلی اقامتی یونیورسٹی تھی۔ اس کے شیخ الجامعہ حضرت عبادہ بن صامت تھے۔ عبداللہ بن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہاں لکھنا سکھاتے اور معلّمِ کتاب و حکمت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی درس دیا کرتے تھے۔

مسجد کی تعمیر کے ساتھ ہی اُمہات المومنین کے لیے حجرے بھی بنائے گئے۔ پہلے دو تھے، بعد میں بڑھتے گئے۔ یہ حجرے آٹھ فٹ سے لمبے چوڑے نہ تھے۔ ان کی چھت بھی اتنی ہی اونچی تھی جو کھجور کے پتوں سے پاٹی گئی تھی۔

۷ھ، ۶۲۸ عیسوی میں جنگِ خیبر سے کامیاب لوٹے تو حضورؐ نے محسوس فرمایا کہ مسجد نبویؐ نمازیوں کے لیے تنگ ہو رہی ہے، اسے بڑا کرنے کی ضرورت ہے۔ اب کی مرتبہ چوکور شکل میں بنایا گیا۔ لمبائی سو ہاتھ تھی یعنی ڈیڑھ سو فٹ اور چوڑائی بھی سو ہاتھ تھی یعنی ڈیڑھ سو فٹ۔ مسجد کی چوڑائی کے لیے کچھ زمین کی ضرورت تھی۔ مسجد نبویؐ سے لگی ہوئی جگہ ایک انصاری صحابی کی تھی،

رسالت پناہ نے کہلوایا کہ ــ زمین کے اس ٹکڑے کو جنت کی ایک عمارت کے بدلے دے سکتے ہو۔ حضرت عثمانؓ نے سُنا تو دوڑے دوڑے اُن انصار صحابی کی خدمت میں پہنچے۔ وفاءالوفا میں ہے' دس ہزار درہم میں ان سے زمین کا سودا کیا اور خوشی خوشی خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوئے ۔ عرض کیا۔ یارسول اللہ! مسجد میں اضافے کے لیے آپ کو زمین کی ضرورت ہے؟ ارشاد ہوا کہ ہاں اشد ضرورت ہے۔

عرض کیا ــ جس قیمت پہ اُن انصار صحابی سے آپ یہ سودا فرمارہے تھے، اس پر میں تیار ہوں! اللہ اللہ کیا مزاج شناسی، کیا عقیدت مندی اور اپنے رسول کی بات پہ کیا عشق تھا! یہ ایک ہی موقع نہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کو جنت کی بشارت ملی۔ مدینہ میں رومہ کا کنواں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کرنے پر بھی انہیں جنت کی خوشخبری ملی تھی اور لشکرِ عسرہ کا سامان کرنے پر اسی مسجدِ نبویؐ کے منبر سے حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ــ اب عثمانؓ کے جرم و گناہ ان کو تکلیف نہ دیں گے۔ یہ نصیب، اللہ اکبر!

حضرت عثمانؓ نے مسجدِ نبویؐ کی توسیع کا کام پہلی ربیع الاوّل ۲۹ھ (۶۴۹ عیسوی) سے شروع کیا۔ پہلی محرم ۳۰ھ کو یہ کام تکمیل کو پہنچا۔ اس زمانے میں آپ خود بھی سنتِ نبویؐ کی پیروی میں مسجد نبویؐ بنانے کا کام کرتے رہے۔ مسجد سے کبھی باہر نہ نکلتے تھے۔ دن کو روزہ رکھتے اور رات کو بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز رہتے تھے۔

حضرت جعفر طیارؓ کا آدھا مکان حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسجد میں شامل کر دیا گیا تھا باقی اب شامل کر دیا گیا۔ ترشے ہوئے پتھر کی دیواریں اور ستون بنائے گئے۔ چھت میں لکڑی لگائی گئی۔ دروازے وہی چھ رہے اور مسجدِ نبویؐ اب ایک سو ساٹھ ہاتھ لمبی اور ایک سو پچاس ہاتھ چوڑی ہو گئی۔

اسلامی تعمیرات سے مراد یوں تو وہ ساری عمارتیں ہیں جو مسلمانوں نے بنائیں۔ ان کے علاوہ شہر، باغات، نہریں، سڑکیں وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔ لیکن فنی اور تاریخی اہمیت کے ساتھ عام طور پر مسجدوں ہی کا ذکر پہلے کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں پہلا سالِ ہجری وہ یادگار زمانہ ہے جب اسلامی تعمیرات کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ مسجدِ نبویؐ کی تعمیر سے مسلمانوں کی فنی تاریخ شروع ہوتی ہے کیونکہ مسجدِ قبا تو صرف اینٹے اور پتھر جما کر حد بندی کی گئی تھی۔ (باقی)

اسلامی قانون سازی کا اہم ترین مسئلہ

از جناب محمد امین صاحب۔ ریاض، سعودی عرب

اسلامی نقطۂ نظر سے قانون سازی کے سلسلے میں جو اہم فکری اور عملی مسئلہ اس وقت پاکستان کو درپیش ہے وہ یہ ہے کہ مملکت میں اس بات کا فیصلہ کون کرے کہ کسی مسودۂ قانون میں کیا بات غیر اسلامی ہے اور کیا اسلامی۔ یہ مسئلہ ان معنوں میں نیا نہیں ہے کہ پہلے اس پر غور نہ ہوا ہو لیکن اس وقت اس کی اہمیت اس لیے بڑھ گئی ہے کہ یہ ہمیں عملاً درپیش ہے کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے قانون سازی ہو رہی ہے اور انشاءاللہ آئندہ بھی ہوگی۔

ماضی میں حکومتوں نے اس کا یہ حل پیش کیا کہ دستور میں یہ بات لکھ دی کہ "پاکستان میں کوئی قانون خلاف قرآن و سنت نہیں بنے گا" اور یہ کہ "موجودہ قوانین کو اسلام کے مطابق بنانے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں گے"[1] لیکن اس انداز سے لکھی گئی (مثلاً پالیسی کے بنیادی اُصولوں میں)، کہ اس پر عمل درآمد نہ ہونے کی صورت میں عدالتوں سے رجوع نہ کیا جا سکے[2] قانونِ آزادئ ہند، پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کو حق قانون سازی بھی دیتا

---

[1] دستور ۱۹۵۶ء، آرٹیکل ۱۹۸

دستور ۱۹۶۲ء، آرٹیکل ۱ (باب دوم)

دستور ۱۹۷۳ء، آرٹیکل ۲۲۷

[2] A. K. BROHI FUNDAMENTAL LAW OF PAKISTAN P-784

تھا۔ پاکستان بننے کے بعد صرف یہ تبدیلی ہوئی کہ بس دینی جماعتوں اور علماء کے اصرار پہ قرارداد مقاصد پاس کر دی گئی (اور خود اس قرارداد کو بھی ہمیشہ پچھلی حکومتوں نے دستور کی تمہید اور دیباچے کے طور پر رکھا کیونکہ اس صورت میں یہ عدالتی طور پہ نافذ نہیں ہو سکتی)[1] نیز دساتیر میں ایک مشاورتی اسلامی ادارے کی بنیاد رکھی گئی جس کا کام یہ تھا کہ وہ قانون ساز ادارے کے لیے ایسے رہنما اصول وضع کرے جو قانون سازی میں اس کے لیے رہنمائی کا کام دے سکیں، گویا اسلامی نظریاتی کونسل (باختلاف الاسماء) کے علماء اور سکالرز کا کام یہ تھا (اور ہے) کہ وہ عندالطلب مشورہ دے دیں اور سفارشات پیش کر دیں۔ باقی جہاں تک اس چیز کا تعلق تھا کہ یہ فیصلہ کون کرے کہ کسی قانون میں کیا چیز اسلامی ہے اور کیا غیر اسلامی، تو یہ بات قانون ساز اداروں پر چھوڑ دی گئی[2] اور ان قانون ساز اداروں کے ممبران کا جو حال تھا وہ غالباً کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہے کیونکہ کسی دستور نے قومی اسمبلی کے ممبران کے لیے اسلامی نقطہ نظر سے اہلیت کی شرائط کبھی نہیں رکھیں، سوائے اس کے کہ عمر اتنی ہو، یا وہ پاکستان کا شہری ہو، سرکاری ملازم نہ ہو، کسی اخلاقی جرم میں سزا یافتہ نہ ہو وغیرہ[3] اور چونکہ کسی سابقہ حکومت کو اس بات سے عملی دلچسپی نہ تھی کہ قانون سازی

---

[1] M. MUNIR, COMMENTARY ON THE CONSTITUTION OF ISLAMIC REPUBLIC OF PAKISTAN, P-67

[2] MOHAMMAD SIDDIQ V. COMMISSIONER, LAHORE DIVISION, P.L.D 1962 LAHORE 999 ALSO SEE K.J. NEWMAN, ESSAYS ON THE CONSTITUTION OF PAKISTAN, P-228

[3] دستور ۱۹۵۶ء، آرٹیکل ۴۳ اور ۴۵
دستور ۱۹۶۲ء، آرٹیکل ۱۰۳
دستور ۱۹۷۳ء، آرٹیکل ۶۲

اسلام کے مطابق ہو لہٰذا یہ بھی ہوا کہ ایک ایک دن میں بیسیوں قوانین بغیر بحث کے پاس ہو گئے[1] اور غیر اسلامی قوانین بھی علماء کے اصرار اور احتجاج کے باوجود پاس ہو گئے[2]

ایک مشاورتی اسلامی ادارے کا وجود نہ صرف یہ کہ اس زمانے میں بے کار اور معطل ثابت ہوا جب کہ حکومتیں قوانین کو اسلامی بنانے کے عمل میں دلچسپی نہ رکھتی تھیں بلکہ موجودہ دور میں بھی وہ اپنی افادیت ثابت نہیں کر سکا۔ ملاحظہ فرمایئے کہ اس نے کتنا کام کیا اور اس میں سے کتنے پر عمل درآمد ہوا:۔

— کونسل نے "پاکستان کوڈ" کی پہلی آٹھ جلدوں اور بعض دیگر قوانین سمیت کل ۳۲۹ قوانین پر غور کر کے ان پر اپنی سفارشات مرتب کیں۔ ان میں سے کسی پر عمل درآمد نہیں ہوا۔

— ۱۷ قوانین کے مسودے حکومت کو پیش کیے جن میں سے صرف ۶ باقاعدہ قانون بنے۔ (لیکن قانون بننے سے پہلے کونسل کے مسودوں میں ترامیم بھی کی گئیں اور ان پر ٹھیک طریقے سے عمل درآمد بھی آج تک نہیں ہوا)۔

— کونسل نے قوانین سازی پر ۱۵ اور نظامِ تعلیم، زراعت، معاشی اور معاشرتی نظام وغیرہ پر ۸ مبسوط رپورٹیں پیش کیں لیکن سوائے بلاسود بنکاری کے کسی رپورٹ کو شائع کرنے کی اجازت نہیں مل سکی۔ (سینکڑوں آدمیوں کے سامنے صدر صاحب کی یقین دہانی کے باوجود[3]) اور نہ ہی کسی پر عمل درآمد ہوا۔

---

[1] ڈاکٹر ایم۔ اے رزاق، پاکستان کا نظامِ حکومت اور سیاست۔ صفحہ ۲۴۸ وما بعد

[2] مثلاً عائلی قوانین کا آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۱ء جو اسلامی نظریاتی کونسل ہی نہیں بلکہ وزارتِ قانون سے بھی غیر اسلامی قرار دیئے جانے کے باوجود آج تک موجود ہے۔

[3] پہلے علماء کنونشن (منعقدہ اسلام آباد ۲۱، ۲۲ اگست ۱۹۸۰ء) میں صدر کی تقریر، روداد کنونشن مطبوعہ وزارت مذہبی امور، صفحہ ۲۳۲۔

جہاں تک صدرِ مملکت کا تعلق ہے وہ اسلامی نظام نافذ کرنے کے خواہش مند اور مدعی ہیں۔ انہوں نے کام کرنے اور اسے آگے بڑھانے کے سلسلے میں کونسل کی پوری پوری مدد کی، لیکن کونسل کے اس مطالبے اور اس کی تکرار سے زچ ہو کر کہ اس کی سفارشات پر عمل درآمد بھی کروایا جائے، انہوں نے دوسرے "علماء کنونشن" میں ڈھکے چھپے لفظوں میں کہہ دیا کہ جب ہم پورے ڈھانچے کو اسلام کے مطابق کر رہے ہیں تو نظریاتی کونسل کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے[1]۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس خیال پر عمل درآمد کی یہ صورت نکالی کہ مئی ۱۹۸۴ء کے آخر میں جب موجودہ کونسل کی میعاد پوری ہو گئی تو انہوں نے نئی کونسل نامزد ہی نہیں کی۔ چنانچہ اس وقت سے کونسل موجود نہیں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے قانون سازی کے سلسلے میں ایک مشاورتی ادارے کا وجود غیر مؤثر ہے، خواہ اس میں کتنے ہی جید علماء اور قابلِ اعتماد سکالرز موجود ہوں۔

اس سلسلے میں جہاں تک عدالتوں کے کردار کا تعلق ہے تو یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ عدالت کا کام قانون بنانا نہیں ہوتا بلکہ اس کی تشریح کرنا اور اس پر عمل درآمد کرانا ہوتا ہے۔ ایک اسلامی ملک میں عدالتِ عالیہ کو یہ اختیار تو ہوتا ہے (یا کم از کم ہونا چاہیے) کہ وہ ہر اس قانون کو یا اس کے کسی جزء کو کالعدم قرار دے دے جو خلافِ اسلام ہو لیکن یہ بہرحال اس کا کام نہیں ہوتا کہ وہ اس کی جگہ نیا قانون بنا کر انتظامیہ کو دے۔ جہاں تک موجودہ وفاقی شرعی عدالت کا تعلق ہے تو جیسا کہ معروف ہے، اس کا دائرہ کار خاصا محدود ہے اور وہ بہت سی چیزوں کو ہاتھ ہی نہیں لگا سکتی[2]۔ اگر اس پر سے

---

[1] دوسرے علماء کنونشن (منعقدہ اسلام، ۴، ۵ جنوری ۱۹۸۴ء) میں صدر کی تقریر، روداد کنونشن مطبوعہ وزارت مذہبی امور، صفحہ ۱۶۵ و ۱۶۷۔

[2] CLAUSE 203 (A-E) OF THE CONSTITUTION (AMENDMENT) ORDER 1980 (PRESIDENT'S ORDER 1 OF 1981)
جس کی رو سے آئینی، عدالتی، اجرائی قوانین، عائلی قوانین اور ہر قسم کے مالی قوانین پر یہ عدالت غور نہیں کر سکتی۔

یہ پابندیاں اٹھا بھی لی جائیں اور وہ ہر قسم کے قوانین کو کالعدم قرار بھی دے دے تو بہر حال ان خلافِ اسلام قوانین کی جگہ وہ اسلام کے مطابق قانون بنا کر تو نہیں دے سکتی کیونکہ یہ اس کا دائرہ کار نہیں ہے۔ علاوہ ازیں وفاقی عدالت کے فیصلوں کا توڑ بھی حیلے بہانے سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً پاکستان کے فوجداری قانون کو بدلنے کے لیے شرعی عدالت نے تقریباً پانچ سال پہلے فیصلہ کیا تھا، اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل حکومت نے دائر کر دی۔ اور پھر وہاں یہ درخواست دائر کر کے عدالتی کارروائی معطل کروا دی کہ حکومت اس موضوع پر قصاص و دیت کا قانون نافذ کرنا چاہتی ہے لیکن وہ قانون آج تک نافذ نہیں ہوا۔[1]

اس سلسلے میں ہمارے علماء کا رویہ بھی قابلِ غور ہے۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی دوسری رپورٹ کے مسودے میں قانون سازی کے لیے یہ تجویز کیا گیا تھا کہ پانچ علماء کا بورڈ صدرِ مملکت کے ساتھ کام کرے گا۔ اگر اس بورڈ کو اسمبلی کے فیصلے پر کچھ کہنا ہو اور وہ متفقہ رائے سے فیصلہ کر دے تو صدر اس رائے کے ساتھ متعلقہ بل کو واپس اسمبلی میں بھجوا دے گا۔ اسی طرح کے بورڈ صوبائی اسمبلیوں میں بھی تجویز کیے گئے تھے۔[2] علمائے کرام نے کراچی کے اجتماع میں کثرتِ رائے سے یہ تجویز مسترد کر دی اور اس کے بجائے یہ تجویز کیا کہ کسی قانون کو غیر اسلامی ہونے کی وجہ سے کالعدم قرار دینے کا اختیار سپریم کورٹ کو دے دیا جائے اور وہاں علماء کا تقرر کیا جائے۔[3] علمائے کرام نے یہ موقف غالباً اس لیے اختیار کیا تھا کہ بورڈ تعلیماتِ اسلامیہ کی صورت میں ایک تلخ تجربہ انہیں ہو چکا تھا اور

[1] DR. TANZIL-UR-REHMAN, ENFORCEMENT OF ISLAMIC LAW IN PAKISTAN – A NEW APPROACH, P-6

[2] ملاحظہ ہو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ، سیکشن نمبر ۵ اور ۶

[3] دستوری سفارشات اور پاکستان کے اکابر علماء کا متفقہ تبصرہ اور ترمیمات، ضمیمہ چراغ راہ، جولائی ۱۹۵۳ء، صفحہ ۸۔

انہیں اسمبلی اور سیاست دانوں سے کسی زیادہ مثبت رویئے کی توقع نہ تھی۔ اس کے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان دو باتوں میں فرق کی نوعیت ذہن میں رکھنی چاہیے ایک تو یہ کہ قوانین جیسے کیسے بھی بنیں، بن جائیں اور ان کی چیکنگ کا کام بعد میں سپریم کورٹ میں ہو، دوسرا یہ کہ جب قوانین بن رہے ہوں تو اس وقت ہی کوئی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ وہ غیر اسلامی نہ ہوں۔ ہمارے نقطۂ نظر سے اس دوسرے رویے پر زیادہ زور دیا جانا چاہیے تھا۔ اگرچہ اس کے ساتھ اعلیٰ عدالتوں کو قوانین کے خلافِ اسلام ہونے کی صورت میں انہیں کالعدم قرار دینے کا اختیار لازماً ہونا چاہیے تھا۔

اس وقت تک ہم نے جو کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے قانون سازی کے سلسلے میں ایک مشاورتی اسلامی ادارہ غیر مؤثر ثابت ہوا ہے اور عدالتیں بھی اس سلسلے میں ایک محدود کردار ہی ادا کر سکتی ہیں۔ لہٰذا بات وہیں آکر ٹھہرتی ہے کہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب اسمبلیاں (جو بڑی حد تک خود مختار ہوتی ہیں) کیا شرعی نقطۂ نظر سے قانون سازی کر سکتی ہیں یا اس کی اہلیت رکھتی ہیں؟ اس بات کا علمی جواب دینے سے پہلے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ عملی حالات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ حقیقی مشکلات کے تناظر میں صحیح حل بھی پیش کیا جا سکے۔

ماضی میں اسمبلیوں نے قانون سازی کے سلسلے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ معروف ہے، (یعنی یہ کہ انہوں نے کوئی مثبت اور قابلِ ذکر کام نہیں کیا) لہٰذا ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم موجودہ مجلس شوریٰ یا فیڈرل کونسل کا ذکر کریں گے کیونکہ اس کے خالق جناب صدر مملکت نے جو اپنی اسلام پسندی کی وجہ سے معروف ہیں اس کی تشکیل کے وقت کہا تھا کہ ہم نے ممبران کے شجرہ ہائے نسب کا اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے۔ چنانچہ ہم مختصر طور پر اس کی ہیئت اور کارگزاری کا جائزہ لیں گے۔

وفاقی کونسل کی ہیئت[۱]

زمیندار و کاشت کار ۶۵

---

[۱] یہ اعداد و شمار ۲۸۷ ممبران کے ہیں جو پہلی دفعہ نامزد کیے گئے تھے (اصلاً ۲۸۸ آدمی نامزد کیے گئے تھے لیکن ایک نے حلف ہی نہیں اٹھایا)۔

وکلا	۳۸
صنعت کار و تجار	۳۵
علماء	۱۵
دیگر	۱۳۴

سٹینڈنگ کمیٹی برائے قانون و پارلیمانی امور:

وکلا	۷
زمیندار	۱
عالم دین	۱

وہ اسلامی قوانین جو آج تک مجلس شوریٰ نے پاس کیے ہیں، ان کی تعداد ۴ ہے ان کی مختصر روداد یہ ہے:

۱۔ قصاص و دیت آرڈیننس:

یہ مسودہ قانون ۸۲-۱-۱۸ کو وفاقی کونسل میں پیش ہوا اور ۸۴-۳-۲۶ کو پاس ہوا۔ کونسل کو اس پر غور کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے میں اڑھائی سال لگے۔ اس مسودہ کو نظریاتی کونسل نے ۱۹۷۹ء میں بنانا شروع کیا تھا۔ پھر جب یہ مختلف مراحل سے گزر کر وفاقی کونسل میں پہنچا تو یہاں یکے بعد دیگرے پانچ کمیٹیوں نے اس پر غور و خوض کیا جن میں ایک وہ سلیکٹ کمیٹی بھی تھی جس کے صدر چوہدری الطاف حسین ایڈووکیٹ تھے اور یہ سات ممبران پر مشتمل تھی (جس میں ۳ وکلا، ۲ خواتین اور ۲ علماء دین شامل تھے) اس کمیٹی کی متنازعہ رپورٹ میں نظریاتی کونسل پر جارحانہ حملے کیے گئے بلکہ کونسل کی آڑ میں اسلامی قوانین کے بارے میں بھی غلط تاثر بالواسطہ طور پر اجاگر کیا گیا۔ دوسری طرف کمیٹی کے عہدہ داروں اور اس کی کارکردگی کے خلاف شریک علماء کا سخت ردِ عمل سامنے آیا۔ بالآخر صدر مملکت کو ذاتی طور پر اس معاملے میں مداخلت کرنا پڑی[1]

[1] جسارت - ۹ اپریل ۱۹۸۴ء۔

اور وفاقی وزیر مذہبی امور راجہ ظفر الحق کی قیادت میں ایک کمیٹی بنی جس نے ایک نئی رپورٹ تیار کر کے کونسل سے جولائی ۱۹۸۴ء میں منظور کروائی ۔

۲۔ قانونِ شہادت آرڈیننس :

اس قانون کا مسودہ وفاقی کونسل میں ۱۴/۱۱/۸۲ کو پیش ہوا اور ۵ ماہ بعد ۳۰/۳/۸۳ کو پاس ہوا ۔ جس سلیکٹ کمیٹی نے اس پر غور کیا وہ ۱۵ ارکان پر مشتمل تھی جن میں اکثریت وکلا کی تھی ، چار علمائِ دین تھے ۔ یہ کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ اسلامی نظریاتی کونسل کا مسودہ ناقابلِ عمل ہے[1] چنانچہ اس نے پرانے قانونِ شہادت مجریہ ۱۸۷۲ء میں ہی چند تبدیلیاں کر کے کونسل میں پیش کر دیا اور وہ پاس ہو گیا ۔ اس پاس شدہ قانون کے بارے میں کونسل کی اسلامائزیشن کمیٹی کے چیئرمین اور سابق چیف جسٹس پشاور ہائی کورٹ کی رائے یہ تھی کہ یہ پچھلے (انگریزوں کے وضع کردہ) قانونِ شہادت ہی کی نقل ہے ، بس سیکشنوں کے نمبر بدل دیئے گئے ہیں اور اسلامی نقطۂ نظر سے چند سطحی قسم کی تبدیلیاں کی گئی ہیں[2]

۳ — فامِلی کورٹس آرڈیننس :

۱۸/۱/۸۲ کو یہ وفاقی کونسل میں پیش ہوا اور ۲/۲/۸۳ کو پاس ہوا ۔ وفاقی کونسل کو اسے پاس کرنے میں ۱۳ ماہ کا عرصہ لگا ۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق رکن مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل نے کہا کہ موجودہ صورت میں یہ ایک بیکار قانون ہے ، کیونکہ اس کے اسلامی کردار سے متعلق جو باتیں نظریاتی کونسل نے اس میں رکھی تھیں یا تو وہ ختم کر دی گئی ہیں یا بدل دی گئی ہیں[3]

---

[1] دیکھیے قانونِ شہادت سے متعلق وفاقی کونسل کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۲

[2] DR. TANZIL-UR-REHMAN , IBID , P-10

[3] مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل ممبر نظریاتی کونسل ، انٹرویو ماہنامہ " اذان " برمنگھم انگلینڈ ، شمارہ نومبر ۱۹۸۳ء ، صفحہ ۸

۴۔ قانونِ حقِ شفعہ:

یہ بھی ۸۲/۸/۱۸ کو وفاقی کونسل میں پیش ہوا اور کونسل نے اسے تین مہینے کے بعد پاس کر دیا ــــ اس میں بے شمار تبدیلیاں کی گئیں۔ اس پر بھی تبصرہ کرتے ہوئے اسلامائزیشن کمیٹی کے چیئرمین اور پشاور ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس صاحب نے فرمایا کہ وفاقی کونسل نے قانون کے مسودے میں (جسے اسلامی نظریاتی کونسل نے بنایا تھا) اتنی ترامیم کی ہیں کہ یہ مسودہ دوبارہ غیر اسلامی ہوگیا ہے[1]۔

اس مختصر جائزے سے جو نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱ ــ وفاقی کونسل اس عرصے میں صرف چند قوانین ہی پر غور کر سکی، کوئی بڑا کام اس سلسلے میں نہیں ہوا۔

۲ ــ وفاقی کونسل میں جو قانون سازی ہوئی وہ اسلام کے حق میں کم ہے اور اس کا زیادہ حصہ اسلام کے خلاف ہے یا اسلام سے آزاد۔ نظریاتی کونسل کے مسودوں میں نہ صرف یہ کہ بے شمار تبدیلیاں کی گئیں، بلکہ شوریٰ کی بعض کمیٹیوں نے نظریاتی کونسل اور اس کے کام کی کھلم کھلا مخالفت کی۔

۳ ــ اس وفاقی کونسل میں علماء کی جتنی تعداد تھی اتنی آج تک کسی اسمبلی میں نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ کوئی فعال اور مثبت کردار اسلامی قانون سازی کے حق میں ادا نہ کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ انہوں نے یہ کوشش کی کہ غیر اسلامی قوانین نہ بننے دیں اور اس میں بھی انہیں کوئی بہت زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

یہ سب کچھ اس ماحول میں ہوا کہ ہر سُو اسلام کے نعرے اور چرچے ہیں اور اس مجلس کے نمائندے اُس شخص کے ذاتی طور پر منتخب کردہ ہیں جو ہمہ وقت رہے، دن رات اسلام کا نام لیتا ہے اور جسے شریعت کے نفاذ کا دعویٰ اور اُس پر فخر ہے۔ اگر پاکستان میں

---

[1] DR. TANZIL-UR-REHMAN IBID, P-9

انتخابات نہیں ہوتے تو اس شوریٰ کی کارکردگی تو ظاہر ہے اور اگر انتخابات ہوتے ہیں تو اگرچہ اس وقت مستقبل کی اسمبلی یا شوریٰ کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ صدر صاحب کی نیک خواہشات کے باوجود[1] اس میں علما دیانت اسلامی ذہن رکھنے والے لوگ اتنی بڑی تعداد میں آجائیں گے کہ وہ اسمبلی میں قانون سازی کا رُخ بدل دیں گے۔ بلکہ توقع یہی ہے کہ حسب معمول اسمبلی کی ایک بڑی اکثریت صنعت کاروں، زمینداروں، پیشہ ور سیاستدانوں اور وکلا، خوشامدیوں، طالع آزماؤں، دینی شعور سے بے بہرہ، سنئے اور خام افراد پر مشتمل ہو گی۔ اور ان کے رویے اُن رویوں سے بھی کم تر ہوں گے جن کا تجزیہ ہم پچھلے ۳۷ برس سے کر رہے ہیں۔ تو گویا بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ آئندہ جو اسمبلی یا شوریٰ بنے گی وہ اسلامی نقطۂ نظر سے قانون سازی کے سلسلے میں صدر صاحب کی نیک خواہشات کے باوجود، کوئی مثبت کام شاید ہی کر پائے گی۔

پیشتر اس کے کہ صورتِ حال کے اس تجزیے سے ہم نتائج اخذ کریں اس سلسلے میں ایک اور مشکل کی طرف اشارہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ جن مسودہ ہائے قوانین کا اُوپر ذکر ہوا ہے ان کو شوریٰ سے پاس ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے مثلاً:

۱۔ قاضی کورٹس کا مسودۂ قانون ۲۰ ۸۲/۲ کو پاس ہوا تھا، اب اسے دو سال ہونے کو آرہے ہیں، لیکن یہ ابھی تک نافذ نہیں ہو سکا۔

۲۔ قصاص و دیت کا قانون جولائی ۸۴ء میں پاس ہوا تھا، ابھی تک نافذ نہیں ہوا۔

---

[1] جب صدر صاحب چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر، چیف آف دی آرمی سٹاف اور صدر مملکت ہونے ہوئے اور نامزدگی کا کلی اختیار رکھتے ہوئے مجلس شوریٰ میں ایسے لوگوں کی اکثریت نہیں لاسکے جو نفاذِ شریعت اور اسلامی قوانین کی پُرجوش حمایت کرتے تو نئی اسمبلی منتخب ہو جانے کے بعد اور محض سول صدر بن جانے کے بعد وہ کیا کر پائیں گے؟

۳- قانونِ شہادت ۸۴/۳/۲ کو پاس ہوا اور ۸۴/۱۰/۲۷ کو یعنی ڈیڑھ سال بعد نافذ ہوا۔

سوال یہ ہے کہ کیا نظریاتی کونسل، لا ء کمیشن، وزارتِ مذہبی امور، وزارتِ قانون اور مجلس شوریٰ ان سب اداروں کی چھلنی سے چھلنے کے باوجود وہ مسودے اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں فوراً نافذ کر دیا جائے۔ آخر صدر صاحب کیوں انہیں اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں؟ اس کا جواب صدر صاحب کی زبانی سنیئے۔ دوسرے علماء کنونشن (منعقدہ اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۴ء) کی افتتاحی تقریر میں انہوں نے اسلامی قوانین کے نفاذ میں تاخیر کے ضمن میں قاضی کورٹس کے مسودۂ قانون کے بارے میں فرمایا کہ یہ اس لیے معلق چلا آرہا ہے کہ شوریٰ سے پاس ہو کر جب یہ میرے پاس آیا تو پتہ چلا کہ علماء اس پر مطمئن نہیں ہیں چنانچہ اسے ایک اور کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا[۱]۔ سوال یہ ہے کہ گومگو کی اس کیفیت کے پیچھے کیا بات کارفرما ہے؟ اتنے اداروں سے گزر کر آنے کے باوجود اس پر اطمینان کیوں نہیں ہوتا؟ بظاہر اس سوال کے جواب میں مجھے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صدر صاحب کو خود شرحِ صدر حاصل نہیں ہوتا کیونکہ وہ فقیہ نہیں ہیں اور بحیثیت صدر مملکت جب وہ سارے طبقوں کو خوش اور مطمئن رکھنا چاہتے ہیں تو فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

تو قصہ مختصر یہ کہ جیسا کہ جنوری ۱۹۸۳ء کی اسلامائزیشن کانفرنس میں غلام اسحاق صاحب نے فرمایا تھا کہ بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ کسی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کون کرے[۲]۔ یہ ملک میں مروج سیاسی نظام کا کام ہے کہ وہ اس کا جواب دے اور یہ اشد ضروری ہے کہ مملکت کی بنیاد پر ایسا ادارہ (یا ادارے) وجود میں لائے جائیں جو اس قومی مسئلے کا پائیدار حل پیش کریں۔ (باقی)

۱۔ دوسرے علماء کنونشن میں صدر کی افتتاحی تقریر، صفحہ ۱۶

۲۔ جناب محمد صلاح الدین، مضمون نفاذِ اسلام کانفرنس، جسارت، کراچی، ۹ فروری ۱۹۸۳ء۔

کتاب سازی و کُتب خانہ سازی

(اسلام کا ایک ثقافتی ورثہ)

جناب محمد حلیم چشتی صاحب

(۳)

عباسی دَور کی اہمیت عہدِ عباسی میں اسلامی قلمرو کے مرکزی شہروں میں کاغذ سازی کے کارخانوں اور سوق الکتب کا قیام علوم وفنون کی تربیت و تدوین اور تنوّع و کثرت، ترویج و اشاعت، تصنیف و تالیف، دوسری زبانوں سے ترجمۂ کتب کے عالمگیر سلسلہ کا آغاز، عالمی ادب کی حفاظت اور ترجمہ کے ذریعہ عمومی طور پر اس کی نشر و اشاعت، اسلامی شہروں میں وراقوں کے کوچوں اور مستقل محلوں کی آباد کاری، کتب خانہ سازی کی عالمگیر تحریک کا احیاء اور ہمہ اقسام کے کتب خانوں کا قیام اور ان کی فنی تنظیم، اسی دَور کی برکات ہیں۔ ان وجوہ سے اسلام کی تاریخ میں کتب و کتب خانوں کی تشکیل و ترویج کا سب سے زیادہ روشن و تاباں دَورِ عباسی دَور ہے۔

ذہنی طاقت کا سرچشمہ موجودہ دَور میں مُلکی طاقت کا سرچشمہ حسبِ ذیل تین طاقتوں کو تسلیم کیا گیا ہے اور ان کی تنظیم و تشکیل بھی عہدِ عباسی میں بدرجۂ اتم ہوتی ہے:

۱۔ فوجی طاقت (MILITARY POWER) جس کے متعلق قرآن نے کہا

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ۔ (الانفال - ۶۰)

(اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے

سہنے والے گھوڑے اُن کے مقابلہ کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے سے
اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداد کو خوف زدہ کر دو،
جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے)۔

۲۔ اقتصادی طاقت (ECONOMIC POWER) اقتصادی طاقت کے بقاء و ارتقاء کے لیے اسلام نے زکوٰۃ، صدقات، غنائم و جزیہ وغیرہ کا مستقل نظام قائم کیا ہے۔

۳۔ ذہنی فکر و دانش کی طاقت (INTELECTUAL POWER) جس کو پروان چڑھانے کے لئے نبی کے فرائض منصبی میں "یعلمھم الکتاب والحکمۃ" (البقرہ) (وہ ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے) کو داخل کیا گیا۔ قرآن نے علم کتاب و حکمت سے بہرہ ور افراد کا ذکر بڑے ہی امتحان کے مواقع پر کیا ہے، چنانچہ حضرت جالوت کے متعلق فرمایا ہے۔ "وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم (البقرہ ۲۴۷) (اور اس کو دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں)۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق فرمایا ہے۔ "اتیناہ الحکمہ وفصل الخطاب (ص ۲۰) -(اس کو حکمت عطا کی تھی۔ اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی) اور حضرت لقمان کے بارے میں فرمایا ہے)" ولقد اتینا لقمان الحکمہ" (لقمان - ۱۲) - اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی) اور سورۂ حدید میں فرمایا گیا ہے "لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط، وانزلنا الحدید فیہ بأس شدید ومنافع للناس" (الحدید - ۲۵ - ۵۷) (ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی، تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ یہ اس لیے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے)
اس سے معلوم ہوا کہ اقوامِ عالم میں قوت کا توازن اور اعتدال قائم رکھنے کے لیے

انہی تین طاقتوں کی ضرورت ہے، لیکن ذہنی فکر و دانش کی طاقت اصل طاقت ہے اور فارسی والوں کا تو مقولہ ہی ہے " توانا بود ہر کہ دانا بود " اس اصل ذہنی طاقت کا سرچشمہ کتب و کتب خانہ میں فکر و دانش کی طاقت مذکورہ بالا ہر دو طاقت کی بقاء و ارتقاء اور ان کے برمحل و صحیح استعمال کی ضامن ہے اس لیے اس کو ان دونوں مذکورہ بالا طاقتوں سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں اس سے اندرونِ ملک قومی عزم و استقلال کی تعمیر کی جاتی ہے اور بیرونِ ملک نفسیاتی جنگ (PSYCHOLOGICAL WARFARE) لڑی جاتی ہے۔ زمانۂ امن میں اس سے قومی وقار میں اضافہ اور جنگ کی صورت میں اس سے (MORALE) حوصلہ، ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے۔ بیرونی ممالک کو اپنا ہمنوا بنانے اور دشمن کو کمزور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بڑی بڑی کامیابیاں اسی طاقت کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہیں۔ اس لیے اس کو نہایت مؤثر اور اہم قوت تصور کیا جاتا ہے۔ فکر و دانش کی طاقت کے ترقی کرنے اور پروان چڑھنے کا مرکز کتب اور کتب خانہ ہے۔ موجودہ سائنسی دور میں طاقت کے حسب ذیل سات عناصر مانے گئے ہیں [1]

۱۔ جغرافیہ GEOGRAPHY.

۲۔ قدرتی وسائل اور خام اشیاء NATURAL RESOURCES AND RAW MATERIAL.

---

[1] HARALD AND MARGAZET SPROUT, FOUNDATION OF NATIONAL POWER, 2ND EDITION (NEW YARK), D. VAN NASTAND CO., 1952, PP. 43-50 IBID, P. 111-138 - HANS MORGENTHAN POLITICS AMONG NATIONS, THE STRUGGLE FOR POWER AND PEACE, SED (NEW YARK) ALFRED A. KNOPE, INCOR 1964 PP 112-128

۳- آبادی POPULATION

۴- ٹیکنالوجی TECHNOLOGY

۵- نظریات IDEOLOGIES

۶- عزم واستقلال MORALE

۷- قیادت LEADERSHIP

فکر ودانش کی طاقت کا ان مذکورہ بالا سات عناصر میں سے آخری چار عناصر سے نہایت گہرا اور ابتدائی تین عناصر سے عمومی ربط وتعلق ظاہر ہے۔ فکر ودانش کے سرمایہ کی حفاظت، اشاعت و ترقی کا مرکز کتب وکتب خانہ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ملک وملت کی فلاح وبہبود کا کتب وکتب خانوں سے نہایت قریبی اور بہت ہی گہرا رشتہ ہے۔ اور قومی بقا وارتقاء و ترقی میں کتب اور کتب خانوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے، چنانچہ کسی خطہ ومملکت میں آباد قوموں کو زیرنگیں رکھنے کے لیے حکمران قوم کا محکوم اقوام سے ذہنی سطح میں بلند تر ہونا لازمی امر تھا اور ہے، تاریخ اسلام اس امر کی شاہد عادل ہے کہ حجاز ونجد کے رہنے والے حاملین کتاب بدوؤں کا سلطنت روما، شام وایران جیسی متمدن اقوام کی مملکتوں پر اپنا دبدبہ وشوکت قائم کرنے میں کامیابی، ان کی ذہنی سطح کی رفعت وبلندی کا بین ثبوت ہے جو انہیں اسی کتاب سے نصیب ہوئی تھی۔

اسلام نے فکر ودانش کی طاقت کے سرچشمہ کتب وکتب خانہ کی ترویج واشاعت اور تحفظ وتوسیع پر بہت زور دیا ہے۔ عہدِ عباسی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ تاریخ کے اس سنہری دور میں کتب وکتب خانوں کی سب سے زیادہ کثرت رہی ہے۔

کتب خانہ: ایک تہذیبی وثقافتی ورثہ کی اساس حقائقِ اشیا سے فراہم کی ہوئی معلومات پر ہر قوم اپنے علمی، معاشرتی، تاریخی وثقافتی نظریات کی تشکیل وتعمیر کرتی اور انہی افکار ونظریات کے مطابق اپنا نظامِ فکر وعمل مرتب کرتی ہے اور وہی اس قوم کی خاص تہذیب کہلاتی ہے، انہی افکار ونظریات پر مبنی فلسفۂ زندگی کے مطابق وہ ہر شعبۂ علم

کو ترتیب دیتی اور تشکیل کرتی ہے[1]۔ اس علمی سرمایہ و ثقافتی ورثہ کے مظاہر کتب خانے ہیں۔ اس لیے کتب خانوں کو ہمیشہ ثقافتی مرکز کہا جاتا ہے۔ ہر قوم کے نظام فکر و عمل کی بدولت ان کے علوم و فنون میں تنوّع، کثرت، وسعت پیدا ہوتی ہے اور علوم و معارف کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی قوت کے سہارے اس قوم کے علوم و فنون اور کتب خانے فروغ پاتے رہے ہیں۔

شاہانِ عباسی کی علمی و ثقافتی سرگرمیوں اور رنگ آمیزیوں سے ایرانی، کلدانی، مصری، یونانی و ہندی تہذیب و تمدن، مشرق میں وسیع تر اسلامی تمدن بنا[2] اور مشرق و مغرب میں جہاں کہیں کوئی نئی حکومت قائم ہوئی یا کوئی نئی قوم برسرِ اقتدار آئی وہ بھی اُن کی علمی و ثقافتی سرگرمیوں سے متاثر ہوئی اور علم نوازی، معارف پروری میں انہی کے نقشِ قدم پر چلی۔

عہدِ عباسی میں مسلمانوں نے دُنیا کی تمام متمدن اقوام پر محض سیاسی یا فوجی غلبہ ہی حاصل نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے اپنے اعلیٰ علمی افکار، نہایت مدلل نظریات و ترقی یافتہ ثقافت، نادر تحقیقات، بیش بہا معلومات، تجربات اور انکشافات کو اپنے طرزِ فکر و عقیدے کے مطابق مرتب کر کے پیش کیا جس کی وجہ سے ایک ایسی پاکیزہ و شاندار تہذیب وجود میں آئی جس کے رنگ میں دُنیا رنگتی چلی گئی۔ اور صدیوں تک دُنیا اسی تمدن، تہذیب و ثقافت کی تقلید کو فخر سمجھتی رہی۔ ان کے مرتب و مدوّن کیے ہوئے ثمرات و نتائج کی روشنی میں یورپ کے مفکر و دانش ور آگے قدم بڑھاتے رہے[3]۔ اس سے ثابت ہوتا

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ علمی تحقیقات کیوں اور کس طرح، کراچی۔ ادارۂ معارفِ اسلامی ب، ت، ص ۴۔۵

[2] معین الدین احمد ندوی، تاریخ اسلام، ط ۲، اعظم گڑھ معارف پریس، ۱۹۴۹ء جلد ۳ ص ۲۔

[3] گستاولی بان تمدن عرب، مترجم سید علی بلگرامی، آگرہ، مطبع مفید عام (باقی بر صفحہ آئندہ)

ہے کہ عہدِ عباسی کا علمی و تحقیقاتی ادب اور اس کے ثقافتی مظاہر سے طالب علموں، استادوں، دانشوروں اور محققوں کے لیے علم و بصیرت، دانش و آگہی کے لیے سب سے زیادہ کشش و جاذبیت کا باعث رہے۔ اسی دانشورانہ طاقت کے سہارے مسلمان اپنے اور اپنے زیرِ نگیں اقوامِ عالم کے اخلاق، سیرت و کردار، اذہان و افکار کی تعمیر و تشکیل کرنے اور تحقیقاتی ادب کے پروان چڑھانے میں سرگرمِ عمل رہے۔ وہ علماء و محققین جو اس سلسلہ میں ان کی مدد کرتے یا ان کی تحقیقاتی سرگرمیوں، علمی کاوشوں اور ذہنی ثمرات و نتائج کے سونے کے بھاؤ قیمت ادا کر کے ان کی ہمت افزائی کر کے علمی سرمایہ میں اضافہ کرتے رہے تھے[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ثقافتی مظاہر سے مسلمانوں کی علمی بقا و ارتقا کا سب سے زیادہ مؤثر و اہم سبب رہے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ سابقہ)

۱۸۹۸ء - ص ۳۹۹-۴۰۱ و ۴۴۴-۴۴۵۔

PHILIP K. HILTI, HISTORY OF THE ARABS 5TH ED-REV (LONDON MACMILLAN & CO 1953) P. 410

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] احمد ابن القاسم ابن ابی اصیبعہ، عیون الانباء طبقات الاطباء، بیروت، دارالفکر ۱۳۷۷ھ جلد ۲ ص ۱۴۳۔

انوارِ حرمین

جناب خلیل حامدی صاحب

(۲)

۲۷ دسمبر ۱۹۸۴ء کو ہم مساجد کونسل کے اجلاس سے فارغ ہو کر شام کو پانچ بجے مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔ عزیزم سہیل احمد ہمیں اپنی گاڑی میں مدینہ لے گئے۔ میاں صاحب کے علاوہ عزیزم حسن فاروق بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کا سفر ہم نے شارع الہجرۃ سے کیا۔ یہ وہ راستہ ہے جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت کرتے وقت اختیار فرمایا تھا۔ یہ راستہ نہ صرف نسبتاً مختصر ہے، بلکہ نہایت بابرکت بھی ہے۔ سعودی عرب نے یہ سڑک بھی نہایت معیاری بنائی ہے۔ چار گھنٹے میں بآسانی مکہ سے مدینہ پہنچا جا سکتا ہے۔

۲۷ دسمبر ۱۹۸۴ء کی شام کو ہم مدینہ منورہ روانہ ہوئے اور ۲۹ دسمبر ۸۴ء کی شام کو وہاں سے جدہ آ گئے ہیں۔ ہمیں دو دن مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں قیام کا موقع ملا۔ ہماری رہائش فندق التیسیر میں رہی۔ یہ ہوٹل حرمِ نبویؐ سے بہت قریب ہے۔ اذان سن کر بھی آدمی باجماعت نماز میں شریک ہو سکتا ہے۔

اِن دنوں مسجد میں زیادہ بھیڑ نہیں ہے، البتہ جمعہ کے وقت خاصا ہجوم تھا اور مواجہہ شریف میں جا کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام پیش کرتے وقت بھیڑ غیر معمولی تھی۔ عام نمازوں میں نماز کے بعد کچھ دیر انتظار کر کے مواجہہ شریف میں بغیر بھیڑ کے

سلام پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ریاض الجنۃ میں بھی نوافل ادا کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔

حرمِ نبویؐ کی فضا پر نور بسیط چھایا رہتا ہے۔ نمازوں کے اوقات ہوں یا عام اوقات مسجد میں بیٹھنے والے عالمِ استغراق میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ذکر و فکر، تسبیح و تحمید، تلاوت و مطالعہ اور صلاۃ و سلام کے متنوع مناظر چاروں طرف دکھائی دیتے ہیں۔ اِن دنوں زیارت کے لیے آنے والوں میں اکثریت مصر اور الجزائر اور مراکش کے لوگوں کی ہے۔ پاکستانی بھی کثیر تعداد میں نظر آرہے ہیں۔ یہ وہ پاکستانی ہیں جو سعودی عرب میں مقیم ہیں اور جونہی انھیں موقع ملتا ہے یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر طبیعت میں اطمینان اور مسرت کی لہر اُٹھ کھڑی ہوتی ہے کہ پاکستانی نوجوان بڑے ذوق و شوق سے دربارِ رسولؐ میں حاضری دیتے ہیں اور نماز اور سلام میں ان کی وارفتگی قابلِ دید ہوتی ہے۔ مواجہہ شریف کے سامنے کھڑا سپاہی اپنے ساتھی سے پاکستانیوں کے جذب و جنوں کی تصویر بیان کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ "ھم یحترقون" (یہ لوگ تو سوختہ دل ہیں)۔

ہم اللہ تعالیٰ کا بڑا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہمیں ریاض الجنۃ کے اندر نماز پڑھنے اور کچھ لمحاتِ فکر گزارنے کا بار بار موقع ملا ہے۔ یہ جگہ بڑی مبارک اور انوار و تجلیات کا مرکز خاص ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ما بین منبری و بیتی روضۃ من ریاض الجنۃ (میرے منبر اور گھر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ رات ہو یا دن اہلِ دل اس جگہ نماز پڑھنے اور تلاوتِ قرآن کرنے کے لیے مسابقت کرتے رہتے ہیں۔ ریاض الجنۃ کے اندر سجدے کتنے لطف دیتے ہیں، جہاں خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ ریز ہوتے رہے ہیں۔ آپ کے صحابہؓ خدا کے سامنے جبہ سائی کرتے رہے ہیں، صحابہؓ کے بعد تابعین، تبع تابعین، ائمہ کرام، فقہائے عظام اور اہلِ تقویٰ و ورع یہاں رکوع و سجود گزارتے رہے ہیں۔ درس و تدریس کی محفلیں جمتے رہے ہیں، مراقبہ و محاسبہ کی دنیا بساتے رہے ہیں۔ ان تصورات نے

یہاں کے سجدوں کو بڑا پُر ذوق بنا دیا ہے۔
یہ بندۂ خطا کار جب کبھی ریاض الجنۃ میں نماز پڑھتا اور سر بسجود ہوتا تو جسم میں ایک جھرجھری پیدا ہوتی۔ کبھی دل و دماغ یہ تصور کر کے مسرت و شادمانی میں ڈوب جاتے کہ اس عظیم جگہ پر پیشانی رکھنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے اور کبھی ندامت و ملامت کے جذبات طاری ہو جاتے کہ مجھ عصیاں کار کو یہ شرم نہیں آتی کہ گناہوں سے آلودہ پیشانی اِس پاک و بلند مرتبہ جگہ پر رکھ رہے ہو،
مگر پھر دل کو سمجھا کر کچھ تسلی ہو جاتی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غفور بھی ہے اور رحیم بھی۔ وہ تجھے اگر یہاں لے آئی ہے تو یہ اُس کی تجھ پر بڑی عنایت ہے۔ اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے اور اس کی مغفرت و رحمت کے حصول کی فکر کرنی چاہیے۔ ان جذبات و تصورات کے اندر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دُعا زبان پر جاری ہو جاتی کہ:

رب اغفر وارحم واعف عنا وتکرم وتجاوز عما تعلم
انك تعلم مالا نعلم۔ انك انت الاعز الاکرم۔

اے میرے رب! بخش دے، رحم فرما، معاف کر دے، مہربان ہو جا، جو گناہ تیرے علم میں ہیں اُن سے تجاوز فرما، تو وہ کچھ جانتا ہے جو ہم نہیں جانتے۔ بے شک تو بڑا غلبہ رکھنے والا اور بڑا اکرم کرنے والا ہے۔

ریاض الجنۃ کی ایک شان تو وہ ہے جو اُوپر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ میں بیان کی گئی ہے۔ اس کی دوسری شان بھی عجیب ہے۔ ایک ستون پر جو روضہ مبارک کی جالی سے متصل ہے اور سب سے اگلی صف میں نصب ہے یہ عبارت کندہ ہے کہ ھذہ اسطوانۃ السریر (یہ چارپائی والا ستون ہے)۔ اس جگہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چارپائی بچھائی گئی تھی۔ اُسی قطار میں جالی سے متصل دوسرا ستون ہے جس پر لکھا ہوا ہے ھذہ اسطوانۃ الحرس (یہ پہرے کا ستون ہے) یہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظ بیٹھتے تھے۔ تیسرے ستون پر ھذہ اسطوانۃ الوفود لکھا ہوا ہے۔ یہاں آنحضورؐ باہر سے آنے والے وفود سے ملتے تھے۔ ایک

اور ستون کی تحریر یہ ہے: ھٰذہ اسطوانۃ عائشہ رضی اللہ عنہا یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نماز تہجد گزارتی رہی ہیں۔ ایک اور بھی بڑا دلچسپ ستون ہے۔ یہ اسطوانۃ ابی لبابہ ہے۔ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ سے ایک اہم راز افشا کر دینے کی چوک ہو گئی تھی۔ اس پر انہوں نے اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے اس ستون کے ساتھ باندھ لیا تھا اور تمام کھانا پینا چھوڑ دیا تھا تاآنکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی توبہ قبول ہوئی۔ نفس کی تادیب اور محاسبے کی یہ عبرت انگیز مثال ہے۔

خاکسار ان ستونوں کو دیکھتا، کبھی ان کے ساتھ لگ کر بیٹھتا۔ بس دل تھا اور اک موجِ اضطراب تھی۔ روح بے چین، دماغ متزلزل اور طبیعت بے قرار۔ یہ کیا مقامات ہیں۔ ان مقامات نے کن برگزیدہ ہستیوں کو جگہ دی ہے۔ ایمان و ایقان کے یہاں کیا دریا بہتے رہے ہیں۔ خدا اور بندے کے درمیان یہاں کیسے کیسے رشتے استوار ہوتے رہے ہیں۔ فیض و فضل کے کیا کیا جام یہاں لنڈھائے گئے ہیں۔ انوار و تجلیات نے یہاں کیا کیا کرشمے دکھائے ہیں۔ یہ کیا مقامات ہیں اور میں کیسے یہاں آ بیٹھا ہوں۔ میں کیا ہوں۔ میری ہستی کیا ہے۔ عقل و خرد جواب دیے جا رہی ہے۔ اک بے خودی طاری ہے۔ یہ کیوں طاری ہے۔ اللہ اللہ۔ دیدۂ بینائی یا شہپرِ عنقائی!!

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا
کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

حرم نبوی کی انتظامیہ نے اب عورتوں کے لیے بھی ریاض الجنۃ میں نماز گزارنے اور مواجہہ شریف پر جا کر سلام عرض کرنے کے لیے نمازِ ظہر کے بعد وقت مقرر کر دیا ہے۔ اس وقت ریاض الجنۃ کو اور مواجہہ شریف کو مردوں سے خالی کروا لیا جاتا ہے۔ یہ نہایت مناسب انتظام ہے۔ عورتیں تو مردوں سے بھی زیادہ رقیق القلب ہیں۔ ان دونوں مقامات پر ان کی دلگدازآہیں اور آشفتہ سری الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ ایک افریقی عورت، سیاہ فام، عمر رسیدہ، سادہ لباس میں ملبوس، اپنی زبان کے سوا دنیا کی ہر زبان و ادا سے ناواقف مواجہہ شریف میں کھڑی ہے۔ آنکھوں سے زار زار آنسو ٹپک

رہے ہیں۔ لباس و شکل سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی دور دراز اور انتہائی پسماندہ افریقی ملک سے آئی ہے۔ وہ زبان سے کچھ کہنا چاہتی ہے، مگر اظہار خیال میں عاجز ہو رہی ہے۔ "بے زبانی ہے زباں میری" اس کا سہارا بنی ہوئی ہے۔ جس ہستی کو وہ سلام کرنے آئی ہے، اُس کی محبت نے اس کے دل میں ایسا سوز بھر دیا ہے کہ فراق تو فراق، وصل بھی اس کے لیے فزونیٔ اضطراب کا موجب ہو رہا ہے۔ اس طرح کے انسانی تموج و اضطراب اور درد و سوز کے نمونے یہاں قدم قدم پر ملتے ہیں۔

رات تیسیر ہوٹل میں گزاری۔ آج جمعۃ المبارک کا دن ہے، جلدی سے حرم شریف میں چلے گئے تاکہ اگلی صفوں میں جگہ مل جائے۔ جمعہ کی پہلی اذان ہونے سے پہلے تک لوگ تلاوتِ قرآن یا ورد و ذکر میں مصروف رہے۔ تلاوت کی گونج مسجد میں بڑے دل نشین انداز میں پھیل رہی ہے۔ مسجد میں تلاوتِ قرآن کا یہ انداز یہاں کی تمام مسجدوں میں عام ہے۔ اگر یہ انداز منصورہ کی مسجد میں رواج دیا جائے تو میرا خیال ہے کہ ہمارے بعض نازک طبع دوست ہی تلاوت کرنے والوں کی خبر لے ڈالیں بایں دلیل کہ اس طرح اُن کی نماز میں یک سوئی نہیں رہتی۔

جمعہ کا خطبہ نوجوان خطیب عبداللہ الزاحم نے دیا۔ خطبے میں انھوں نے یہاں کے عام طریقے سے ہٹ کر اسلام کی بنیادی باتوں اور دعوتِ اسلامی کے تقاضوں اور مسلمانوں کی غفلت کو موضوع بنایا۔ دوسرے خطبے میں انھوں نے اُن عرب نوجوانوں پر تنقید کی جو سونے کی انگشتریاں اور سونے کی چین والی گھڑیاں ہاتھوں میں پہنتے ہیں۔

عصر کے بعد شہدائے احد کو سلام کرنے کے لیے گئے۔ مسنون طریقے سے ان کے حق میں دعا کی اور پھر تھوڑی دیر رک کر خاکسار اور جناب محترم میاں صاحب اور حسن فاروق اور عزیزم سہیل حامدی غزوۂ احد کے مقامات و احوال پر گفتگو کرتے رہے۔ ہم جبل رُماۃ کے دامن میں کھڑے تھے اور چشم تصور میں لشکر کفار ابوسفیان کی قیادت میں اور لشکرِ اسلام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں گھوم رہا تھا۔ سامنے وہ پہاڑ تھا جسے اُحد کہتے ہیں اور جس کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: احد یحبنا ونحبہ

(احد ہم سے اور ہم احد سے محبت کرتے ہیں) **احد کا میدان جہاں تاریخِ اسلام کی دوسری اہم جنگ لڑی گئی۔ اب میدان نہیں ہے بلکہ طرزِ نو کا سٹلائٹ ٹاؤن ہے۔**

مغرب کی نماز حرم نبوی میں ادا کرنے کے لیے ہم واپس چل دیئے۔ مدینہ منورہ اب ماڈرن شہر بن گیا ہے اور بنتا جا رہا ہے۔ یہاں کی نو بنو ماڈل کی کوٹھیاں اور بنگلے، کشادہ سڑکیں، جدید ترین ملبوسات اور جدید ترین سامان آرائش اور جدید ترین اختراعات سے بھرے ہوئے سٹور اور اُونچے درجے کے ہوٹل اس قدر فضائے مدینہ پر محیط ہو چکے ہیں کہ اب یہاں اُن تاریخی مقامات کو تلاش کرنا اور سوز و ہنوں کی ان حکایات کے شواہد ڈھونڈنا جو اسلام کی پہلی ریاست سے وابستہ ہیں، مشکل ہو گیا ہے۔ موٹر میں بیٹھے ہوئے ہیں نے بڑی کوشش کی کہ کوہ سلع نظر آ جائے، کہف بنی حرام دیکھ لیں، سقیفہ بنی سعد کی جگہ دیکھ لیں جہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلافت کا انعقاد ہوا، بئر بضع کا نام و پتہ معلوم کر لیں بئر السقیا اور بئر الخاتم کا محلِ وقوع معلوم کر لیں اور ان لاتعداد مقامات و آثار میں سے کوئی سے دو چار مقامات کا سراغ لگا لیں جو یہاں قدم قدم پر بکھرے ہوئے ہیں، مگر ہر بار نظر خائب و خاسر واپس لوٹ آئی۔ ان آثار کو دیکھنا کوئی شرعی حقیقت نہیں رکھتا صرف تاریخ پسند ذوق کی تسکین اور سیرتِ رسولؐ اور سیرتِ صحابہؓ کے ارضی زاویوں کی تحقیق مطلوب ہے۔ بہرحال جدید مدینہ منورہ عصرِ حاضر کی تہذیب و تمدن کے مناظر پیش کرتا ہے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے۔ ہر دَور اپنے تقاضے لے کر آتا ہے اور انسانوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ عصری تقاضوں کا مقابلہ کرنے اور اپنے تشخص کو قائم رکھنے کے لیے انسان کے اندر غیر معمولی قوتِ عزم و ارادہ درکار ہے جو یہاں بڑی حد تک مفقود ہے۔ اس وقت مدینہ منورہ میں ہوٹلوں کی بھرمار ہے۔ جدھر جائیں نئے نئے عالیشان ہوٹل نظر آتے ہیں۔ خوشحال زائرین کے لیے ان ہوٹلوں کا قیام بڑی سہولت فراہم کر رہا ہے۔

راقم ۱۹۸۴ء کے حج کے موقع پر جب عزیزم سہیل حامدی کے ساتھ مدینہ منورہ آیا تھا تو آثارِ مدینہ کی میدانی تحقیق پر کچھ وقت لگایا تھا۔ تاریخ و آثار کی معتبر کتابوں کے حوالے سے مدینہ منورہ کے تاریخی مقامات کی تحقیق کی تھی اور یہ بھی نوٹ کیا تھا کہ ان مقامات کا موجود

نام کیا ہے اور محل وقوع کیا شکل اختیار کر چکا ہے۔ راقم کو کبھی اللہ نے فرصت عطا فرمائی تو اپنی اس تحقیق کو شائع کرے گا۔

سعودی حکومت کے بعض اداروں نے بھی اب آثار کی تحقیق شروع کر دی ہے۔ سعودی ائیرلائنز کے ماہانہ رسالہ "اہلاً و سہلاً" کے شمارہ جنوری ۱۹۸۵ء میں سعودی عرب کے نامور عالمِ اثریات ڈاکٹر عبدالرحمٰن انصاری کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ حکومت نے آثار و عجائب کے لیے ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ملک بھر میں تمام تاریخی آثار کی کھوج لگا کر ان کی حفاظت کا انتظام کرے۔ نیز جامعہ ریاض میں بھی اس غرض کے لیے ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ علمی طور پر سعودی عرب کے چند اہلِ علم اپنے ذاتی ذوق و شوق کی بدولت اس موضوع پر قابلِ قدر تحقیقات پیش کر چکے ہیں۔ ان میں علامہ حمد الجاسر، الشیخ عبدالقدوس انصاری، عبداللہ بن خمیس، محمد بن ناصر العبودی، سعد بن جُنیدل اور عاتق البلادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ حضرات تو عام آثار و مواقع میں دلچسپی لیتے رہے ہیں، لیکن اسلامی آثار اور عہدِ نبوت و عہدِ خلافتِ راشدہ اور بعد کے ادوار کے اسلامی آثار پر سعودی عرب میں صرف ایک نوجوان خصوصی بصیرت رکھتے ہیں۔ ان کا نام ڈاکٹر سعد عبدالعزیز ہے۔ آج کل وہ ربذہ نامی شہر کی کھدائیوں میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ تاریخی شہر مدینہ منورہ کے مشرق میں ۱۵۰ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے اپنی آخری عمر گزاری ہے۔ یہ جگہ بڑی شاداب ہوتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اسے بیت المال کے جانوروں اور جنگ میں استعمال ہونے والے گھوڑوں کی چراگاہ کے طور پر مخصوص کر رکھا تھا۔

شہدائے احد سے واپسی پر ہم نے ساکنانِ بقیع کو سلام پیش کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بقیع ہی میں آرام فرما ہیں اور بھی جلیل القدر صحابہ و تابعین اور ائمہ کرام اس شہرِ خموشاں میں استراحت فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے درجات بلند فرمائے۔

عشاء کی نماز کے بعد ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے مکان پر احباب نے ایک مختصر اجتماع

کیا۔ پاکستان کے تازہ حالات موضوع گفتگو رہے۔ ڈاکٹر نذیر صاحب ہمارے مرحوم دوست ڈاکٹر اسلم چغتائی صاحب کے داماد ہیں۔ مدینہ منورہ میں ایک عرصے سے رہ رہے ہیں۔

۲۹ دسمبر ۱۹۸۴ء ہفتہ کی صبح قبا کی طرف گئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: من تطھر فی بیتہ ثم اتی مسجد قبا فصلی فیہ رکعتین کان کاجر عمرۃ (جس نے اپنے گھر میں طہارت کی (وضو یا غسل کیا) اور پھر وہ مسجد قبا آیا اور اس میں دو رکعت ادا کیں اُسے عمرے کا ثواب حاصل ہوا)۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی حین حیات قبا تشریف لاتے رہے۔ مکہ معظمہ سے جب آپ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تھے تو آپ نے شہر میں داخل ہونے کے بجائے قبا کی وادی میں کچھ روز کے لیے پڑاؤ فرمالیا تھا۔ پھر وہاں ایک مسجد تعمیر ہوگئی جو اسلام کی پہلی مسجد کہلاتی ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت میں اُسی مسجد کی طرف اشارہ ہے: لمسجدٌ اُسِّسَ عَلَی التقوٰی من اوّل یومٍ احقّ ان تقوم فیہ (بے شک جو مسجد روز اوّل سے تقویٰ پر تعمیر کی گئی ہے وہ اس امر کا زیادہ حق رکھتی ہے کہ آپ اس میں نماز ادا کریں)۔

مسجد میں دو رکعت ادا کیں۔ زائرین میں پاکستان اور الجزائر اور لیبیا کے کچھ لوگ بھی مسجد میں موجود تھے۔ راقم نے نماز کے بعد اس مسجد کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالی تو بہت سے لوگ جمع ہوگئے اور بڑے شوق سے ان باتوں کو سننے لگے۔ قدرتاً جب کوئی آدمی پہلی بار یہاں آتا ہے تو نماز کے بعد اُس کے اندر یہ جستجو پیدا ہوتی ہے کہ یہ کیا مقام ہے، اس کی یہ حیثیت کس بنا پر ہے۔ اس رہنمائی کا یہاں کوئی انتظام نہیں ہے، حالانکہ اس پہلو سے زائرین کو بدعات سے بچا کر اسلام اور تاریخِ اسلام کی صحیح اور مفید معلومات مہیا کی جاسکتی ہیں اور زائر یہاں سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام اور صحابہ کرامؓ کی محبت کا جذبۂ وافر لے کر جاسکتا ہے۔

مدینہ منورہ کا قیام بہت مختصر رہا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں انسان تڑپ تڑپ کر آتا ہے اور پھر یہاں سے تڑپ تڑپ کر جاتا ہے۔ ہفتے کو عصر کی نماز پڑھتے ہی ہمارا یہ قافلہ جناب میاں طفیل محمد صاحب کی قیادت میں جدہ روانہ ہوگیا۔ مدینہ منورہ اور ساکنانِ مدینہ منورہ

کو الوداع کہا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ پھر یہاں حاضری کا موقع عطا فرمائے۔

آخر میں مَیں احباب کو ایک اہم اور دلچسپ امرِ واقعہ سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی دعوت یہاں کے نوجوانوں میں اچھی رفتار کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ یہاں کچھ بزرگ تو ایسے ہیں جنہوں نے مولانا کی زیارت کر رکھی ہے وہ اپنی ملاقاتوں کو تاریخی سرمایہ کے طور پر فخر و اعتزاز سے دوسروں کے سامنے بیان کرتے ہیں، مگر نوجوان نسل نے صرف مرحوم کا نام سنا اور اُن کا لٹریچر پڑھا ہے۔ اسی غائبانہ تعارف کی بدولت ہی لوگ مولانا سے غیر معمولی محبت و عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں۔

۲۳ دسمبر ۱۹۸۴ء کو امام محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض میں ایک اُردنی طالب علم کے اُس مقالے پر بحث ہوئی جو اُس نے ڈاکٹریٹ کے لیے لکھا ہے۔ مقالے کا عنوان ہے: "مولانا مودودیؒ اور اُن کا نظریۂ سیاستِ شرعیہ"۔ امتحان کمیٹی نے اس پر بڑی بحث کی اور صاحبِ مقالہ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری جاری کر دی۔ طائف میں ایک سعودی لڑکی ایم۔ اے کے لیے ایک مقالہ تیار کر رہی ہے۔ عنوان ہے: "مولانا مودودیؒ کے تعلیمی نظریات"۔ اسی طرح مدینہ یونیورسٹی میں ہمارے ایک نوجوان کو ایم۔ اے کے لیے ہی موضوع ملا ہے: "مولانا مودودی اور اُن کا طریقِ دعوت"۔ بیشتر ازیں اُم القریٰ یونیورسٹی سے حال ہی میں دو حضرات مولانا مودودیؒ پر تحقیقی مقالے پیش کر کے ایم اے کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ ایک اُردن کے صالح الرقیب جن کا موضوع تھا "مولانا مودودیؒ اور ان کا طریقِ انقلاب" اور دوسرے ہمارے الیف الدین ترابی[1] صاحب جنہوں نے مولانا مرحوم کے تفسیری اسلوب پر تحقیق کی ہے۔ مولانا مرحوم کے ساتھ نوجوان نسل کے یہ چند نمونے بیان کر دیئے ہیں، ورنہ یہاں تو بہت کچھ ہو رہا ہے۔

---

[1] ترابی صاحب ادارہ معارف اسلامی لاہور کے رفقائے کار میں شامل ہو چکے ہیں۔

نفاذِ اسلام میں خواتین کا کردار

محترمہ فیض النساء صاحبہ - کراچی

(یہ مقالہ خواتین کی سیرت کانفرنس منعقدہ اسلام آباد میں پیش کرنے کے لیے لکھا گیا تھا - مقالہ نگار کانفرنس میں نہ جاسکیں۔ اب یہ مقالہ ان اوراق میں پیش کیا جا رہا ہے)

نفاذِ اسلام میں خواتین اور ان کے کردار کی اہمیت یہ ہے کہ دنیا میں معاشرتی اصلاح، اخلاقی سدھار یا احیائے مذہب کی کوئی تحریک بھی خواتین کی شمولیت کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی۔ خواتین ہمارے معاشرے کا نصف حصہ ہیں اور اگر وہ نفاذِ اسلام کے کام میں دلچسپی نہ لیں اور اس میں شریک نہ ہوں، تو مرد خواہ کتنا ہی زور لگائیں، اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ اسلام اور نفاذِ اسلام کی گاڑی اسی وقت رواں دواں ہوگی جب اس کے دونوں پہیے (مرد اور عورت) ٹھیک ٹھیک کام کریں، بلکہ عورتوں کی اہمیت اس اعتبار سے زیادہ ہے کہ وہ ان افراد کو جنم دیتی اور تعلیم و تربیت دیتی ہیں جن سے مستقبل کا معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوموں اور ملکوں کے عروج و زوال کی تاریخ عورتوں کے عروج و زوال سے وابستہ ہے۔ عہدِ نبویؐ میں جب عورتیں اصلاح پذیر ہوئیں، تو ان کی آغوش سے ہی وہ نسلِ نو نکلی جس نے چار دانگِ عالم میں اپنی اخلاقی، علمی اور فوجی فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اگر عہدِ جاہلیت میں عربوں کا معاشرہ جاہلانہ تھا، تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کے مقام

اور اہمیت کو سمجھا نہیں گیا۔

اسلام کو اپنی ذات پر نافذ کیجیے

نفاذِ اسلام کے کام میں عورتوں کی شرکت کی اہمیت کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خواتین نفاذِ اسلام کے لیے کیا کچھ کر سکتی ہیں؟ اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز انفرادی شخصیت ہے۔ نفاذِ اسلام کا عمل اپنی ذات سے شروع ہونا چاہیے ورنہ دوسروں کو نصیحت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دنیا میں صرف اس نصب العین اور اس تحریک کو کامیابی حاصل ہوتی ہے جس کے علمبرداروں کے قول و عمل میں ہم آہنگی ہو اور جس کی اپنی زندگی اپنے نظریے کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔ بنیادی چیز ذہن و فکر ہے۔ نفاذِ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارا یقین روزِ آخرت پر ایسا پختہ ہو کہ اس کے اثر سے عملی زندگی تبدیل ہو کر رہ جائے۔ خدا خوفی ہمارے اعمال سے نمایاں ہو۔ احکامِ شریعت کی پابندی کے ساتھ اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اسلام اور نفاذِ اسلام کی تحریک کے لیے کس سیرت و کردار کی حامل خواتین مطلوب ہیں۔

عورتوں میں دینی تعلیم کی ضرورت

آج کے دور کی مسلم خواتین کا جائزہ لیجیے تو عورتوں کا ایک حلقہ وہ نظر آتا ہے جو علم اور شعور سے محروم ہے یا بہت ہی کم علم اور کم عقل ہے۔ مگر ان میں بھی اکثریت ان عورتوں کی ہے جو گھرداری کے کام کو سلیقے سے انجام دے سکتی ہیں۔ کھانا بھی اچھا پکا لیتی ہیں اور پہننا اوڑھنا بھی جانتی ہیں، لیکن ان کے پاس اسلامی نقطۂ نظر سے چند رسومات کے علاوہ کوئی چیز نہیں۔ ان کی مذہبیت محض ان کی رسوم پرستی ہے یا توہم پرستی، چنانچہ یہ عورتیں نفاذِ اسلام کے لیے ہرگز کارآمد نہیں۔ نفاذِ اسلام تو بڑی بات ہے، بقائے اسلام بھی ان عورتوں کے ذریعے ممکن نہیں۔ ہمارے معاشرے میں چونکہ زیادہ تر عورتیں اسی طرح کی رہی ہیں، اس لیے ہماری نسلیں اسلام سے بیگانہ ہوتی چلی گئیں۔ اگر ہم عورتوں کی اہمیت کو سمجھتے تو انھیں گھر کی مامائیں یا مردوں کی دل بستگی کا ذریعہ بنا کر نہ رکھتے، بلکہ زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتے، اسلام کا حقیقی مفہوم سمجھاتے اور بتاتے کہ قدرت نے عورتوں کو انسان سازی کے عظیم کام پر مامور کیا ہے۔ اس منصب کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اسلام کو خود بھی

سمجھیں اور اپنی اولاد کو بھی اسے صحیح طریقے سے سمجھائیں۔ اس کے بغیر نفاذِ اسلام ممکن ہی نہیں ہے، لہٰذا خواتین کے لیے پہلی ضروری چیز علم، بالخصوص اسلام کا علم ہے۔ کیونکہ علم ہوگا، تو اس کے مطابق عمل ہو سکے گا اور دوسروں کو عمل کی ترغیب دی جا سکے گی۔

سچ پوچھیے تو اسلام بنیادی طور پر مذہبِ علم ہے۔ مسلمان کے لیے جہاں نماز ادا کرنا ضروری ہے وہاں اوقاتِ نماز کا علم اور قرآن مجید کی آیات اور سورتیں یاد کرنا بھی ضروری ہے۔ اسلام کا یہ بنیادی فریضہ اس بات کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ ہر مسلمان خواندہ بھی ہو، تاکہ وہ قرآن پڑھ سکے۔ ہمارا بنیادی ایمان کتابِ الٰہی پر ہے اور کتاب کو براہِ راست پڑھنا اور سمجھنا ہر مسلمان کی ایمانی ذمہ داری ہے۔ عورتوں میں جس قدر زیادہ خواندگی ہوگی، اتنا ہی زیادہ قرآن اور اس کے ترجمے کو پڑھنا، احادیث کا مطالعہ کرنا اور اسلامی لٹریچر سے استفادہ کرنا ان کے لیے ممکن ہوگا۔ وہ خواتین جو نفاذِ اسلام کی تحریک اور اس کے لیے جدوجہد کرنے کی علمبردار ہیں، ان کو اسلام کے ساتھ علم کی بھی مبلغ ہونا چاہیے، کیونکہ اسلام اور علم کے درمیان ایک ناقابلِ شکست رشتہ ہے۔ خواتین کے لیے رسمی تعلیم ہی ضروری نہیں، بلکہ انھیں حالاتِ حاضرہ سے بھی پوری واقفیت ہونی چاہیے۔ اس واقفیت کے بغیر کوئی بھی سیاسی یا مذہبی جدوجہد نہیں ہو سکتی۔ نفاذِ اسلام کے لیے کام کرنے والی خواتین کو چاہیے کہ وہ مطالعے کی عادت کو اپنائیں۔

سادہ زندگی کو نصب العین بنایئے

نفاذِ اسلام کے لیے ایک اور ضروری چیز یہ ہے کہ آپ کا نصب العین مادی آسائشیں، دنیوی لذات اور معیارِ زندگی کی وہ دوڑ نہ ہو جس نے ساری دنیا کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور جس کا انجام بے چینی اور بے اطمینانی کے سوا کچھ نہیں۔ نفاذِ اسلام کی علمبردار خواتین کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ مادی چیزوں کی محبت ایک ایسا سراب ہے جس کے پیچھے دوڑ دوڑ کر انسان بے حال اور بدحال ہونے کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس دوڑ میں شریک انسان اسلام کا کام ہرگز نہیں کر سکتا۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے وہ کردار چاہیے جو ظاہری

زندگی کی چھوٹی چمک دمک کا دیوانہ نہ ہو، جو گھروں کی قیمتی آرائش و آسائش کا تمنائی بننے کے بجائے سادہ زندگی اختیار کرے۔ اُسے جو کچھ ملے وہ اس پہ راضی رہے اور قناعت کو اپنا شعار بنالے۔ وہ قیمتی چیزوں کی محرومی کے ہوکے اور احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہو۔ خدا نے عورتوں میں یہ خوبی رکھی ہے کہ وہ اگر چاہیں تو سوکھے ٹکڑے کھا کر اور پھٹا پرانا کپڑا پہن کر بھی خوش رہ سکتی ہیں، لیکن جو عورتیں زیور کپڑے کو ہی زندگی کا نصب العین بنالیتی ہیں اور خدائی تعلیمات کو چھوڑ کر معیارِ زندگی کے شیطان کو پوجنے لگتی ہیں، ان کا وجود پوری سوسائٹی کے لیے خطرناک اور زہریلا ہو جاتا ہے۔ اسلام کی علمبردار خواتین کو اس خطرے اور اس زہر سے ہوشیار رہنا چاہیے اور جہاں کہیں عورتوں میں یہ برائی نظر آئے، اس کے خلاف جہاد بھی کرنا چاہیے۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام نے کہا تھا، تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ جو انسان محض دولت کمانے کی مشین بن جائے، اس کی انسانیت جاتی رہتی ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارے ہاں کی بیشتر عورتوں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہیں۔ وہ زندگی کی معاشی کشمکش اور معاشی جدوجہد کے بُرے پہلوؤں اور ان کے مسموم اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہیں۔ اس بنا پہ عورتوں کی مردوں کے مقابلے میں اعلٰی اخلاقی اور رُوحانی اقدار سے وابستگی زیادہ گہری ہوسکتی ہے اور ہونی چاہیے لیکن مقامِ افسوس ہے کہ آج کل ہی نہیں، ہمیشہ سے خواتین کی اکثریت پر اعلٰی اخلاقی اور رُوحانی اقدار کے مقابلے میں مادی چیزوں کی محبت غالب رہی۔ یہ اس محبت ہی کا نتیجہ ہے کہ عورتیں قیمتی ملبوسات، زیورات اور بناؤ سنگھار کی مہنگی اشیا کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتی ہیں اور شادی بیاہ میں جہیز کے اسراف کے تماشے اور جھوٹی شان کے مظاہرے بھی اس بات کا نتیجہ ہیں کہ زندگی کا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ہم پر مسلط ہے۔ نفاذِ اسلام کی راہ میں بھی ہوسِ جاہ اور لذتِ مال و منال رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ وہی خواتین نفاذِ اسلام کی جدوجہد میں کامیاب ہوسکتی ہیں جو مادیت سے ماورا رہیں اور ادنٰی اور حیوانی خواہشات سے بالاتر ہوکر اپنے اندر کی ملکوتیت، انسانیت اور روحانیت کو بیدار و متحرک رکھیں۔

خواتین سے رابطے کی ضرورت

اس کے علاوہ یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ نفاذِ اسلام کے لیے صرف باعلم اور باایمان ہونا کافی نہیں سوشل ہونا بھی درکار ہے۔ سوشل ہونے سے مراد یہ نہیں کہ آپ محفلوں میں چہکنے دمکنے کا شوق و ذوق رکھیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اردگرد کے لوگوں سے کٹ کر اپنے گھر یا اپنی خیالی دُنیا میں مگن ہو جانا غلط ہے۔ نفاذِ اسلام کے مقصد کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کا دوسروں سے رابطہ زیادہ اور گہرا رہے۔ آپ اپنے محلے، اپنے عزیز و اقارب کے حلقے اور اپنی سہیلیوں سے میل جول رکھتی ہوں اور بنیادی طور پر انسان بیزار نہ ہوں، بلکہ دوسروں سے اخلاص رکھنے والی اور انسانیت سے محبت کرنے والی ہوں۔ اس خصوصیت کے ساتھ آپ کا عوامی رابطہ اور عام میل ملاقاتیں تحریکی اور دعوتی کاموں کے لیے ایک قیمتی اثاثہ بن جائیں گی۔ آپ کو اپنا پیغام دوسری خواتین تک پہنچانے کے زیادہ مواقع ملیں گے اور لوگ آپ کی باتوں کا اثر بھی زیادہ لیں گے۔ بشرطیکہ آپ کا دوسروں سے ملنا جلنا اس انداز کا ہو کہ لوگ آپ کی ملنساری، خوش اخلاقی، انسان دوستی اور آپ کی سوجھ بوجھ کے مداح ہوں۔ اگر دوسروں سے میل جول کی بنیاد اپنی بڑائی کے جذبے کی تسکین ہو، آپ دوسروں کو حقیر اور کمتر سمجھیں، دوسروں کے دُکھ سے آپ میں اچھے احساسات اور جذبات پیدا نہ ہو سکیں اور سرد مہری طاری رہے، تو آپ کی شخصیت متاثر کن نہیں ہو سکتی۔ اس سے آپ کے مشن کو بھی نقصان پہنچے گا، لیکن اگر آپ دوسروں سے میل جول رکھیں، تو اس سے اسلام کے کام میں مدد ملے گی۔ آپ اپنے محلے، اپنی بستی، اپنے خاندان، اپنے اعزہ اور اپنے دوستوں تک اسلام کا مرکزی پیغام کامیابی سے پہنچانے کا ذریعہ بن جائیں گی۔

اس بات کو بھی خوب سمجھ لیجیے کہ صحیح معنوں میں سوشل ہونے کے لیے انسان دوست اور محبت رکھنے والا ہونا ضروری ہے اور جسے انسانوں سے محبت ہو، وہ ان کی خدمت کے لیے بھی آمادہ رہتا ہے۔ اپنی زندگی کا ایک مقصد خدمتِ خلق بھی بنائیے کیونکہ مخلوقِ خدا کی خدمت عبادت ہے۔ بعض صورتوں میں اس کا ثواب عبادت سے بڑھ کر ہے۔ اپنے حلقے میں وقت نکال کر، غریب بچوں اور بڑوں کو تعلیم دیجیے، مصیبت زدہ لوگوں کی خود بھی مدد کیجیے اور دوسرے مخیر لوگوں کی امداد اُن تک پہنچانے کا ذریعہ بھی بنیے۔ اس کے ساتھ ہی صحتِ عامہ،

امراض کے علاج اور تربیتِ اطفال کے بارے میں آپ کو تمام وہ بنیادی معلومات حاصل کرنی چاہییں جن کے ذریعے آپ کم پڑھی لکھی خواتین کی رہنمائی کر سکیں اور انھیں صحیح مشورے دے سکیں۔ جو خواتین اس طرح خدمتِ خلق کے مشن کو اختیار کریں گی وہ خود بخود اپنے حلقے میں احترام اور محبت حاصل کرلیں گی۔ اِس سے نفاذِ اسلام کے لیے ان کی جدوجہد کے کامیاب ہونے کے امکانات زیادہ ہو جائیں گے۔

نفاذِ اسلام کی جدوجہد کے متعلق یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ انفرادی نہیں، بلکہ ایک اجتماعی جدوجہد ہے اور اجتماعی فوائد حاصل کرنے کے لیے ہے۔ اس اجتماعی جدوجہد کے لیے جماعتی نظم اور ڈھانچہ ضروری ہے۔ اس سے الگ رہ کر کی جانے والی جدوجہد نہ تو زیادہ دیر تک جاری رہ سکتی ہے اور نہ ہی صحیح طریقے پر کی جاسکتی ہے۔ اس لیے نفاذِ اسلام کی علمبردار خواتین کو اجتماعی جدوجہد کے لیے ایک نظام سے وابستہ ہونا چاہیے۔ انہیں ایک جماعتی قیادت اور اجتماعی لائحہ عمل کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ یاد رکھیے کہ اپنے آپ میں مگن ہو جانا شیطان کا فریب ہے۔ شیطان کبھی اجتماعیت کو برداشت نہیں کرسکتا بلکہ ہمیشہ اس کی راہ میں حائل رہتا ہے۔ انفرادی انا کو جماعتی نظم سے ہم آہنگ کرنا مسلمان کا شیوہ ہے۔ بدقسمتی سے مغرب کی مادہ پرستانہ اقدار نے ہمیں منتشر کر دیا ہے اور فرد کسی ایسے نظم میں بندھنے کے لیے تیار نہیں جو اس کے احساسات کو ناگوار گزرے اور اسے من مانی نہ کرنے دے۔ آپ کو نفس و شیطان کی چالوں سے ہوشیار رہنا چاہیے اور یہ بات سب کو یاد کرا دی چاہیے کہ نفاذِ اسلام کا تقاضا اجتماعی نظم سے وابستگی اور نظم کی پابندی ہے۔

یہ وہ چند بنیادی شرائط اور خصوصیات ہیں جو نفاذِ اسلام کا کام کرنے والی خواتین کے لیے لازمی ہیں۔ الحمدللہ کہ ان میں سے بہت سی خصوصیات ہمارے حلقے کی کارکن خواتین میں موجود ہیں، تاہم جو کمی ہے اُسے بھی پورا کرنے اور مذکورہ خصوصیات اپنے اندر پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اگر ان خصوصیات کے ساتھ کام کرنے والی خواتین کے حلقے ہر جگہ موجود ہوں، تو ان کی جدوجہد ان شاء اللہ کبھی رائیگاں نہیں جاسکتی۔

رسائل و مسائل

بے ڈاڑھی امامت اور بنک ملازمت

سوالات:-

(۱)

راقم حافظ قرآن ہے اور ڈاڑھی نہ ہونے کے باوجود قرآن پاک تراویح میں سُناتا ہے۔ پچھلے رمضان اس مسئلے پر مسجد میں بڑا ہنگامہ ہوا۔ مفتی ولی حسن ٹونکی صاحب کا فتویٰ لا کر مسجد میں چسپاں کیا گیا کہ بغیر ڈاڑھی والے کے پیچھے کوئی نماز نہیں ہو سکتی خواہ فرض ہو سنّت ہو یا نفل ہو۔ اس فتویٰ کے بعد میری طبیعت بڑی مکدر رہوئی کیونکہ دو تین مقتدیوں نے اس فتوے کے بعد میرے پیچھے نماز تراویح پڑھنا چھوڑ دی اور ہر شخص جو بھی ملتا یہی کہتا کہ بھئی اب تو رکھ ہی لو۔ خدا کا شکر ہے کہ راقم کو ڈاڑھی سے کوئی چڑ نہیں، بلکہ پختہ ارادہ ہے کہ ڈاڑھی رکھوں گا۔ لیکن اس سے نماز کا تعلق سمجھ میں نہیں آتا اور کئی سوالات ذہن میں آتے ہیں جو آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں اُمید ہے کہ آپ تحقیقی اور مسکت جواب مرحمت فرمائیں گے۔

۱- اگر بے ڈاڑھی والے امام کے پیچھے نماز نہیں ہو سکتی تو بے ڈاڑھی والے مقتدی کی نماز کس اُصول سے صحیح ہوگی۔ اگر نہیں ہوگی تو فتویٰ کی نوعیت عام ہونی چاہیے، صرف امام کو ڈاڑھی کا پابند کرنا کیسے صحیح ہوگا؟

۲- میں نے فقہ حنفی کی کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ فاسق و فاجر کے پیچھے

بھی نماز ہو جاتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو بے ڈاڑھی والے کسی نیک نمازی کے پیچھے نماز کیوں نہیں ہو سکتی؟

۳۔ میں نے فقہ حنفی کی کتاب میں یہ بھی پڑھا کہ نماز کی امامت کے لحاظ سے کون کون مناسب ہے۔ ان وجوہ ترجیح (PRIORITIES) میں ڈاڑھی کا کہیں ذکر نہیں۔

۴۔ بہت سے گناہ ایسے ہیں جن میں اکثر حضرات مبتلا ہیں اور ہمارے مولوی صاحبان بھی مستثنیٰ نہیں۔ ان گناہوں پر بڑی وعیدیں آئی ہیں، مثلاً جھوٹ بولنا منافق کی نشانی ہے۔ بہتان لگانا، غیبت کرنا مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے، اسی طرح بدگمانی کرنا جس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ" ان بعض الظن اثم" جب کہ ڈاڑھی رکھنے کے بارے میں حضورؐ کا حکم ہے، لیکن ڈاڑھی نہ رکھنے والے کے لیے جزا و سزا میرے علم میں نہیں آئی۔ جب ڈاڑھی والے حضرات مولوی صاحبان مندرجہ بالا گناہوں کا ارتکاب کرتے ہوئے لمبے لمبے خطبے اور نمازیں پڑھا سکتے ہیں تو بے ڈاڑھی والے نے آخر ایسا کونسا قصور کیا ہے کہ نماز تراویح کی امامت بھی مشکل ہو جائے، جب کہ وہ حافظِ قرآن ہو، قرآن کا حافظ یا عالم ہونا خود ایک بڑی وجہ ترجیح ہے۔

۵۔ احادیث میں ایک روایت آئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک علاقے کے کچھ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور امام کے بارے میں پوچھا، کیسا ہونا چاہیے۔ آپ نے فرمایا وہ جو تم میں سب سے زیادہ قرآن مجید پڑھا ہو۔ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ اتفاق سے ایک نوعمر بچے کو قرآن مجید یاد تھا۔ جب نماز کا وقت آیا تو انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل میں اُسے امام بنا دیا۔ پیچھے صفوں میں عورتیں بھی تھیں، اتفاق سے بچے کا ستر درست نہیں تھا۔

نماز کے بعد عورتوں کی صف سے آواز آئی کہ اپنے امام کا ستر درست کراؤ۔

مقصد میرا کہنے کا یہ ہے کہ اسی سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام کو قرآن مجید کا جاننے والا ہونا کافی ہے خواہ لفظاً خواہ معناً۔ معنوی علم رکھنے والا زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔

(۲)

اب جب کہ موجودہ حکومت اسلامی نظام کے نفاذ کے اقدام کر رہی ہے اور بنکوں میں بلاسُودی کاؤنٹر کھول دیئے گئے ہیں اور اُمید ہے کہ مستقبل میں بھی مزید اقدامات کیے جائیں گے، تا وقتیکہ پورا معاشی کاروبار سُود سے پاک نہ ہو جائے، تو کیوں نہ لوگوں کو اور خصوصاً تحریکِ اسلامی سے وابستہ افراد کو اجازت دی جائے کہ وہ بنکوں کی سروس اختیار کریں، تا وقتیکہ وہ بھی مستقبل کے معاشی نظام کے کارآمد پرزے بن سکیں بلکہ اسے چلانے والے ہاتھ بھی وہی ہوں۔

دوسرے یہ کہ جب سے بنک قومی تحویل میں لیے گئے ہیں، بنکوں کی سروس ایک سرکاری ملازمت اختیار کر گئی ہے اور اگر سرکاری ملازم ہونے میں کوئی حرج نہیں تو پھر بنک کی سرکاری نوکری کرنے میں کیا چیز مانع ہے؟

تیسرے یہ کہ حکومت کا سارا ہی کاروبار سود پر چل رہا ہے۔ مثال کے طور پر میں ٹریژری آفس میں کام کرتا ہوں اور ہمارے پاس جو اکاؤنٹ بنتا ہے۔ اس میں سُودی اور غیر سُودی تمام قسم کے کھاتے شامل ہیں، اس بارے میں کیا رائے ہے؟

چوتھے یہ کہ موجودہ دور میں حکومت خود ایک تجارتی ادارہ بن کر رہ گئی ہے۔ حکومت کا کوئی بھی شعبہ ہو اس میں سب سرمایہ خلط ملط ہو کر رہ گیا ہے۔ حکومت جو رقم اپنے محکموں کو عطا کرتی ہے وہ بنک کے ذریعے دیتی ہے اور اس پر لگنے والا سود بھی وہ محکمے حاصل کرتے ہیں اور اپنے ملازموں

کو تنخواہیں وغیرہ ادا کرتے ہیں، نیز دفتری ضروریات پوری کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں سائل کو امید ہے کہ آپ تحقیقی اور مسکت جواب سے نوازیں گے۔

جوابات: از شیخ الحدیث مولینا عبدالمالک ناظم شعبۂ استفسارات۔

۱۔ امامت کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر یہ ہے کہ امام علم و عمل کے لحاظ سے دوسروں کی بہ نسبت بہتر ہو۔

الف:۔ امامت کے اس نظریے کا تعلق امامت کبریٰ (حکومت) اور امامت صغریٰ (مسجد کی امامت) دونوں سے ہے۔ مسلمانوں کے حکمران کو بھی ان تمام لوگوں سے اعلیٰ اور افضل ہونا چاہیے جن پر وہ حکمران ہے اور مسجد کے امام کو بھی ان تمام لوگوں سے اعلیٰ و افضل ہونا چاہیے جن کا وہ امام ہے۔ وہ اوصاف جن میں ان اماموں (حکمرانوں اور ائمۂ مساجد) کو دوسروں سے بہتر ہونا چاہیے، قرآن مجید کا حافظ اور عالم ہونا، متقی اور پرہیزگار ہونا، معزز، وجیہ اور باوقار ہونا سرفہرست ہیں لیکن افسوس کہ ہمارے علماء نے حکومت کے بارے میں اس شرعی حکم کو نظر انداز کیا ہوا ہے اور انہیں اس بات کی توفیق نہیں ہے کہ وہ ایسے حکمرانوں کے خلاف فتاویٰ جاری کریں جو شرعی معیار پر پورے نہ اترتے ہوں اور ان فتاویٰ میں بھی اتنا ہی زور ہو جس طرح امام مسجد کے سلسلے میں جاری شدہ فتووں میں ہوتا ہے۔ اللہ کرے وہ اپنی اس کوتاہی پر غور فرمائیں۔

ب:۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کا تعلق سیرت و کردار اور وضع قطع دونوں سے ہے۔ چونکہ ڈاڑھی رکھنے کا حکم بھی احادیث میں آیا ہے اس لیے ڈاڑھی رکھنا بھی ضروری ہے۔

ج:۔ جہاں تک نماز کا تعلق ہے وہ تو وہ ہر ایسے مسلمان کے پیچھے جائز ہے جو نماز ٹھیک طرح سے پڑھا سکتا ہو۔ لیکن باقاعدہ امام صرف ایسے شخص کو بنانا چاہیے جس میں کوئی نمایاں برائی یا کوتاہی نہ ہو۔

د:۔ بہ صورتِ حال بھی قابلِ افسوس ہے کہ بڑی بڑی برائیاں جو فسق کا موجب ہیں، ان کے مرتکب افراد کو تو امام مسجد بنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا، لے دے کے صرف

ڈاڑھی رہ گئی ہے جس کا خیال رکھا جاتا ہے۔ آپ کو یہ حق ہے کہ آپ دوسری برائیوں بعض کا آپ نے تذکرہ بھی کیا ہے اس کے مرتکب افراد کی امامت پر اعتراض کریں اور نمازیوں کو عمومی اور خصوصی طور پر توجہ دلائیں کہ وہ مساجد میں ایسے اماموں کا تقرر کریں جن میں یہ خرابیاں نہیں پائی جاتیں۔ لیکن ڈاڑھی نہ رکھنے کے باوجود تراویح پڑھانے کے اعتراض پر ناراض ہونا یا کسی ردِ عمل میں پڑنا مناسب نہیں۔ مجھے یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ آئندہ کے لیے ڈاڑھی رکھنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

۲۔ آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جب تک بنکوں میں صحیح طرح سے غیر سودی نظام قائم نہیں ہو جاتا اس وقت تک ان کی آمدنی رزقِ حلال کی تعریف میں نہیں آتی۔ باقی رہا ملازمت کرنا نہ کرنا، سو وہ آپ کا ذاتی فعل ہے۔ اس پر خود غور کر کے فیصلہ کریں۔

رہا آئندہ بنک کا نظام چلانے کا نظام سو انشاء اللہ تحریکِ اسلامی کو نئے بنانے ماہرینِ بنک کاری ملتے ہیں اور ملتے رہیں گے۔

(مولانا عبدالمالک)

مطبوعات

تحذیر الناس | از حجۃ الاسلام مولینا محمد قاسم نانوتوی۔ مع تکملہ از مولینا محمد ادریس کاندھلوی۔
ناشر: دارالاشاعت مولوی مسافرخانہ کراچی ۱
قیمت درج نہیں۔ عام قسم کی کتابت وطباعت۔

تحذیر الناس | مؤلف ایضاً۔ ناشر: کتب خانہ رحیمیہ، دیوبند ضلع سہارنپور۔
قیمت: ۴/- روپے

مشہور اثر ابن عباسؓ: فی کل ارضٍ آدمٌ کآدمکم ..... ونبیٌّ کنبیکم کے پس منظر کے ساتھ اس مشہور رسالہ میں مولینا نانوتوی نے مسئلہ ختم النبوت کو لیا ہے۔ زبان و انداز بیان پر منطقیانہ رنگ غالب ہے اور آج کے لوگوں کے ذہنوں کے لیے ایک جنسِ غریب۔ اس منطقیانہ بحث کے خلاف مخالف حلقوں کی طرف سے عوامی عقیدت کو بنیاد بنا کر مناظرانہ طرز پر جو اعتراض اٹھائے گئے ہیں اُن کی گنجائش منطقی اسلوب نے دی ہے، ورنہ نانوتوی صاحب کے نہ عقیدہ و نظریہ میں کوئی حقیقی خرابی ہے اور نہ خدانخواستہ کسی طرح کا فتور نیت!

البتہ راقم اتنی بڑی دینی شخصیت کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہے کہ دین کے بنیادی عقائد (توحید، نبوت، آخرت) کو جس طرح قرآن نے نہایت سادہ اسلوب میں پیش کیا ہے، اسی طرح علمائے دین کو یہ چیزیں بغیر پیچیدہ فلسفیانہ اور منطقی بحثوں کے دل نشیں انداز میں عوام تک پہنچا دینی چاہییں۔ ورنہ مغالطوں اور الجھنوں کا پیدا ہونا یا پیدا کیا جانا بالکل ممکن ہو جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے اثر

کی بنیاد پر بہت سے ایسے سوالات اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن میں سے ہر سوال کوئی نہ کوئی اُلجھن پیدا کرتا ہے ۔ ایک امکانی تصوراتی صورت جس کا ہماری موجودہ عملی زندگی سے گہرا تعلق نہیں ہے ، اس کے متعلق بحث در بحث کسی بھی حتمی فیصلے تک مشکل سے پہنچ سکتی ہے ۔ یہ علماء کے چھیڑنے کی بحثیں نہیں ہیں ہاں اُمت کے دوسرے دانشور یا اربابِ تعقل قیل و قال کر سکتے ہیں ۔

قدرتی علاج	از جناب حاذق الحکماء الحاج حکیم غلام نبی صاحب ۔ ناشر : راجہ غلام قادر عیار

ملنے کا پتہ ، مکتبہ فیض الاسلام ، اقبال روڈ ، راولپنڈی ۔ قیمت : ۱۵/- روپے

یہ کتاب دلچسپ و مفید تو ہے ہی ، کیونکہ کتنے ہی اصحابِ علم و ادب نے اس کے متعلق تقریظی نوٹ لکھے ہیں ۔ مگر ان اوراق کی بحثوں میں مختلف چیزیں آپس میں پیوستہ ہیں مثلاً کچھ شریعت کی باتیں ہیں ، کچھ تفسیری نکات ، کچھ احادیث کی توضیح ، علاج اور مرض کے متعلق دلچسپ جملے ، طبی دنیا کے لیے نئی اصطلاحات وغیرہ ۔

اصل زور اس بات پر ہے کہ دفعیہ امراض کے لیے " قدرتی علاج " کا راستہ اختیار کرنا چاہیے ۔ یعنی پانی ، ہوا ، آگ ، دھوپ ، بھاپ ، مٹی جیسی چیزوں سے ہر مرض کا بے ضرر علاج کیا جا سکتا ہے ۔ ـــــــــــ ویسے ہماری رائے میں رنگوں سے علاج ہو یا ہومیوپیتھی سے یا انجکشنوں اور آپریشنوں کے ذریعے ایک لحاظ سے سبھی قدرتی علاج ہیں ـــ اس معنی میں کہ قدرت کی پیدا کردہ اشیاء و اعمال میں قدرت ہی کی رکھی ہوئی تاثیرات سے کام لے کر مرض سے شفا کی طرف بڑھا جاتا ہے ۔

تاہم اس کتاب کی بہت سی سادہ سادہ ترکیبیں بہت نتیجہ خیز ہیں ۔ ایسے موضوعات پر جو بھی مفید لٹریچر ملے اُسے پڑھنا چاہیے اور استفادہ کرنا چاہیے ۔

ہم اُمید کرتے ہیں کہ کسی آئندہ ایڈیشن میں تازہ تر معلوماتی مواد کو شامل کرنے کے علاوہ ترتیب کو بھی زیادہ بہتر بنا دیا جائے گا ۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۴۰۵

تفہیم القرآن

جلد ششم

کا

نیا ایڈیشن

طبع ہو کر آگیا ہے۔ تاجران کتب اور قارئین کرام
اپنی مطلوبہ تعداد کے لیے پہلی فرصت میں اپنے آرڈر سے

مطلع فرمائیں

ھدیہ ——— ۷۲/- روپے

اِدارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ لاہور

دربار مارکیٹ (میلا رام مل)